اسلامی نظریۂ حیات

مؤلفہ

خورشید احمد

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
کراچی یونیورسٹی کراچی

اسلامی نظریہ حیات
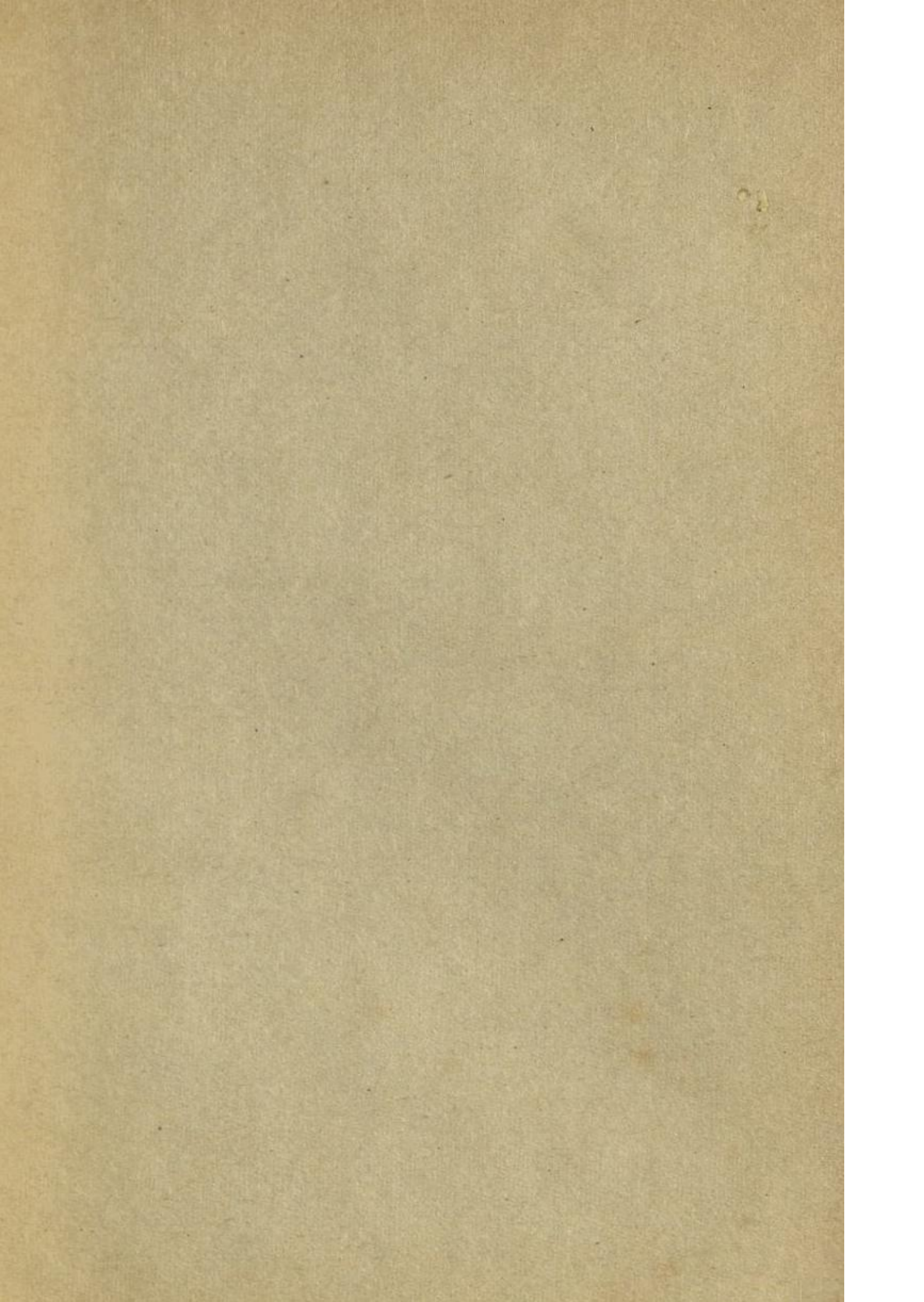
مؤلفہ

خورشید احمد

لیکچرار - کراچی - یونیورسٹی

فہرست

حصّہ اوّل

مذہب اور دَورِ جدید

تمہید

دنیا میں انسان کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں۔ ایک طرف جسم اور روح کے رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے اسے مادی اور جسمانی وسائل درکار ہیں اور دوسری طرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اخلاقی اور تمدنی اصولوں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ مادی اور جسمانی احتیاجات کی تسکین کے لئے وسائل کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ زمین و آسمان میں ودیعت کر دیا ہے اور اخلاقی اور تمدنی رہنمائی کے لئے اس نے انبیاء بھیجے جنہوں نے زندگی گزارنے کا طریقہ انسان کو سکھایا۔ زندگی گزارنے کے اس طریقے کا نام مذہب ہے۔

مذہب انسان کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کوئی معاشرہ کوئی تمدن اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو مذہب سے کلیتاً بے نیاز ہوئی ہو۔ لیکن دورِ جدید کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں مذہب سے انحراف کا ایک بہت واضح اور نمایاں رجحان رونما ہوا اور بالآخر جدید مغربی تہذیب لامذہبیت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ لیکن انسانی تجربہ نے بتا دیا کہ مذہب کو ترک کر کے انسان نہ صرف یہ کہ اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جاتا ہے بلکہ خود مادی وسائل کے استعمال میں بھی وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتا جو فلاح و خوشحالی کے لئے ناگزیر ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوت و اقتدار میں اضافہ خیر و صلاح اور نیکی اور فلاح میں اضافہ کا باعث نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال نے اس صورت حال کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے:

"ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا"

زندگی کی شب تاریک صرف مذہب ہی کی روشنی سے منور ہو سکتی ہے۔

کتابچے اس حصے میں ہم نے دورِ جدید کے پس منظر میں مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے سوالات سے بحث کی ہے۔ پہلا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کا ہے جس میں زندگی کے بنیادی مسائل کو پیش کیا گیا ہے اور ان ذرائع علم سے بحث کی گئی ہے جن کی مدد سے انسان ان سوالات کو حل کر سکتا ہے۔ پھر ان مختلف تمدنی نظاموں کے خد و خال واضح کئے گئے ہیں جو

مختلف قسم کے جوابات کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور اخیر میں اشارتاً یہ بتایا گیا ہے کہ ان سوالات کے جواب کے سلسلہ میں اسلام کس راہ کو اختیار کرتا ہے۔

دوسرے مضمون کا بڑا حصّہ جناب منظور احمد صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون میں مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کے مقام کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس پوری بحث میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے مذہب کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے تاکہ جدید اذہان میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا مؤثر طریقہ پر ازالہ ہو سکے۔ اس مقالہ کے چند مباحث جناب پروفیسر محمود علی صاحب کی نادر کتاب "دین و دانش" اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "الدین القیم" سے ماخوذ ہیں۔

تیسرا مضمون ظفر آفاق انصاری صاحب نے چند مستند کتابوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور اس میں دنیا کے اہم مذاہب کا ایک تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے — اس باب میں ہندومت، بدھمت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی بنیادی تعلیم کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان مذاہب کی مختصر تاریخ اور موجودہ عالمی مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک عمومی جائزہ کے ذریعہ ان کی تعلیمات پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

آخری مضمون پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کے قلم سے ہے۔ اس میں جدید مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے فلسفیانہ بنیادوں کو پیش کیا گیا ہے اور ان پر علمی تنقید کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ مذہب سے بغاوت پر جو نظام بھی بنے گا۔ انسانیت کے لئے تباہی کا باعث ہوگا۔ اس سلسلہ میں ان نئی فکری اور عملی تحریکوں، خصوصیت سے لادینیت اور اشتمالیت پر علمی تنقید کی گئی ہے جو مذہب اور مذہبی فکر کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں تاکہ آج کا نوجوان ان تحریکوں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر ان کے تاریک تر" اندرون کو نظر انداز نہ کر دے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس حصّہ کے مضامین ذہن سے ان تعصبات اور شکوک و شبہات کو دور کرنے میں مفید ثابت ہوں گے۔ جو مغربی اثرات کے زیر اثر ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ ان مباحث کو سمجھ لینے کے بعد اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اس کے نظام حیات کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

زندگی کے بُنیادی مسائل اور اُن کا حل

مذہب، فلسفہ اور تمدن کے کچھ بنیادی سوالات ہیں جن کے حل پر انسانی زندگی کا انحصار ہے، وہ بنیادی سوالات یہ ہیں۔

اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟ اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں؟

نیز یہ کائنات بحیثیت مجموعی کیا ہے؟ اس کو نظم و ضبط میں رکھنے والی اور ایک ہمہ گیر اور محکم قانون کے مطابق چلانے والی ذات کون سی ہے؟ اور اس کی کیا صفات ہیں؟ اس کا انسانوں سے کیا تعلق ہے، اور انسانوں کا اس سے کیا تعلق ہونا چاہیئے؟

کیا ان قوانین طبعی کے علاوہ جو اس عالم میں کارفرما ہیں کوئی اخلاقی قانون بھی ہے؟ اگر ہے تو اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ انسان کی اس کائنات میں صحیح حیثیت اور منصب کیا ہے؟ وہ خود مختار ہے یا کسی کا ماتحت؟ کسی دوسری طاقت اور عدالت کے سامنے جوابدہ ہے یا آزاد اور غیر ذمہ دار؟ اس کا کمال مطلوب کیا ہے۔

یہ اولین اور بنیادی سوالات ہیں جن کو کوئی ایسا نظام ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو اور جس کی جڑیں انسان کے قلب و دماغ میں پیوست ہوں اور اس کی شاخیں انسانی زندگی کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ مذہب انہی سوالات کا یقینی جواب دینے کا دعوٰی کرتا ہے۔ فلسفہ انہی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ تمدن انہی بنیادوں پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے۔ ان سوالات کا متعین جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں، نہ تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ ہر تمدن، خواہ کتنا ہی سطحی اور مادی ہو، ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور رکھتا ہے جو اس کی عمارت کے نیچے بھی بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اور بنیاد کی اس گہرائی سے لے کر اس کے کاخ و ایوان کی بلندی تک یکساں

اثر انداز ہوتا ہے۔ اس ذہنی سرچشمہ سے اس کی زندگی کی ساری نہریں پھوٹتی ہیں اور ان کے رخ متعین ہوتے ہیں۔ معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین و علم و فلسفہ، تہذیب و شائستگی غرض اندرونی اور بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر اس بنیادی تصور کا عکس ہوتے ہیں۔

جہاں ان سوالات کا جواب دینا ارباب فلسفہ اور اہل دانش و بینش کا مشغلہ ہے وہاں ان کے حل سے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنا ہر خاص و عام کے لئے ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سوالات کے حل سے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرے، اس کے لئے کوئی عمل ممکن نہیں، مثلاً آپ یہ سوچ کر دیکھیں کہ کیا آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ آپ زندگی اور موت کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کریں اور اس کے باوجود آپ کے افعال میں منطقی ربط اور عملی حکمت پوشیدہ ہو۔ آپ کا فعل اگر شعوری اور اختیاری ہے تو یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔ یہ مقصد یا تو فلاح آخروی ہوگا یا محض فلاح دنیوی۔ پہلی صورت میں ضروری ہے کہ زندگی بعد موت پر ایمان رکھیں اور دوسری صورت میں اس کو لغو اور وہم خیالی کریں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد ان مسائل کا ایک واضح یا غیر واضح جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ یہی حل معاشرتی زندگی کے مختلف شعبہ جات کی بنیاد بنتا ہے۔ چنانچہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں معاشرہ نے ان سوالات کا فلاں حل قبول کیا تو ہم اس معاشرہ کے سیاسی، معاشی اور دیگر سماجی نقطۂ نظر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یا اگر ہمیں اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی کارناموں کا علم ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مسائل کے حل میں فلاں پہلو اختیار کیا ہوگا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ کسی قوم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان مسائل کے حل کے سلسلے میں ایک پہلو پر ایمان رکھے اور عملی طور پر اس کا متضاد نقطۂ نظر اختیار کرے۔

علم کے ذرائع

ہم کو اس موقع پر دیکھنا یہ ہے کہ ان مسائل کے حل کے لئے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سوالات کو کس کس طرح حل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو اپنی قوتوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ جن سے بظاہر ان مسائل کے حل میں مدد لے سکتے ہیں۔

۱۔ **حواس:**۔ حواس سے مراد وہ پانچ مشہور قوتیں ہیں جنہیں باصرہ سامعہ، لامسہ، شامہ اور ذائقہ کہا جاتا ہے۔ یہی حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے پرانا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں۔ دنیا سے متعلق جس قدر محسوسات کا ہم کو علم ہے ان سب کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ ان ہی کی بنا پر ہم تجربہ اور مشاہدہ کے بعد طبعی قوانین دریافت کر کے اپنے سائنسی علوم کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن حواس اپنی اس وسعت کے باوجود محدود ہیں۔ یہ ہمیں صرف ان اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہیں۔ جن کا محسوس کیا جانا ممکن ہے۔ لیکن ہر موجود کے لئے ضروری نہیں کہ وہ محسوس بھی ہو* مثلاً

---

* بہت سے علماء حواس کو حصول علم کا ایک مشتبہ، ناقابل اور کمزور ذریعہ مانتے ہیں۔
"غلطی کا ایک بڑا ماخذ یہ غلط یقین ہے کہ حواس جو حقیقت میں ہم کو محض عملی اغراض کے لئے عطا ہوئے ہیں ماہیت اشیاء کو ہم پر منکشف کر سکتے ہیں۔
"انسان کا علم بہت ناقص ہے۔ اس کے حواس غیر یقینی اور خطا پذیر ہیں۔ ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ حواس کو دنیا ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ جیسی ان کی فطرت و حالت ہے۔ ادراک حسی میں خارجی اشیاء نہیں، بلکہ محض آلات حس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ حواس پر یقین کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک ایک آلہ ہونا چاہیئے جو ان کی تصدیق و تکذیب کر سکے اور پھر اس آلہ کی جانچ کے لئے ایک اور آلہ ہونا چاہئے۔ اس طرح یہ سلسلہ غیر متناہی ہوگا۔"

زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک محض حواس سے ممکن نہیں۔ ہم زندگی کے مظاہر کا مشاہدہ کر کے زندگی کا قیاس تو کر سکتے ہیں۔ لیکن کبھی دوسرے کی زندگی کو بلاواسطہ طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ چنانچہ معلوم یہ ہوا کہ حواس سے صرف مادی اشیاء کا علم ممکن ہے اور وہ بھی صرف ان اشیاء کے آثار اور خواص کی حد تک۔ مگر جن مسائل سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ سب مابعد الطبیعاتی ہیں مثلاً زندگی کا مبداء اور منتہا ایسی چیزیں ہیں جو نہ ہماری آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہمارے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ اس لئے حواس کے ذریعے ہم ان مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتے۔

۲۔ **عقل:** عقل انسان کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے۔ انسانی علوم میں ترتیب اور ربط اسی کی بنا پر ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا عقل زندگی کے بنیادی مسائل کا حل بھی دریافت کر سکتی ہے تو نتیجہ نفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حصول علم کے لئے تنہا کافی نہیں۔ اس کو اپنے علاوہ اپنے سے کمتر چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے کے لئے جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی ان معلومات سے کام لینا پڑتا ہے۔ جو اس کو پہلے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام عقلی علوم کا تجزیہ کیجئے اور عقل کا دلچسپ و طویل سفر نامہ پڑھئے تو معلوم ہو گا کہ حقائق کی ان نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے بڑے بڑے سمندروں کو عبور کرنے میں اس کا زادِ سفر حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات تھے۔ پس جہاں حواس کام نہ کرتے ہوں وہاں عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جیسے طیارہ بغیر ہوا کے نہیں اڑ سکتا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ زیر بحث مسائل مابعد الطبیعاتی ہیں اور اس لحاظ سے حواس کی گرفت سے باہر ہیں۔ اور جب حواس کی گرفت سے باہر ہیں تو عقل کی رسائی سے بھی ماوراء ہیں۔

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

لیکن عقل کی اس نارسائی کے باوجود انسان نے اپنے تجسس اور خود فریبی کی بنا پر ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کاوش کے حاصل کا نام فلسفہ ہے۔ فلسفہ خواہ مذہب کی مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اپنی اصلیت اور لباس کے لحاظ سے ایک ہی ہے

خدا کی حقیقت، اس کی صفات، اخلاقی قوانین کا مقام وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں اور اس لئے واحد فیصلہ جو عقل ان سے متعلق صادر کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت مدرکہ اشیاء سے مختلف ہے۔ لیکن یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ہر اس فلسفہ کے نزدیک کہ جس نے ان مسائل کے حل تفصیلی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی، یہ اشیاء عام مدرکہ اشیاء ہی کی مانند ہیں۔ اور اس طرح یونانی فلسفہ اور علم کلام دونوں ہی تجسیم کا شکار ہو گئے۔

۲۔ وجدان :- وجدان یا اشراق* سے مراد وہ مفروضہ حق بینی ہے جو حواس اور عقل کی مدد کے بغیر عالم ثانی اور غیبی حقیقتوں کے علم کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو اس ذریعہ کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے نزدیک حسی مشاہدہ اور عقلی استدلال اس نور باطن کے حق میں زہر قاتل ہے۔ صداقت کے یقینی حصول کے لئے شرط ہے کہ تزکیہ نفس کیا جائے اور ان کے تئیں تزکیہ نفس نام ہے ترک دنیا، نفس کشی، ریاضت اور مراقبہ کا۔

ہمارے نزدیک یہ بات تو صحیح ہو سکتی ہے کہ انسان کچھ ایسی مخفی قوتیں رکھتا ہے۔ جن کو بیدار کر کے وہ کچھ ایسی معلومات حاصل کرے جو حواس کے ذریعہ ممکن نہیں لیکن یہ قوتیں بہر حال انسانی قوتیں ہیں اور عقل و حواس کی طرح یہ بھی محدود اور خطا پذیر ہیں۔ یہ حقیقت اس واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ اہل اشراق عالم ثانی کی جو تصاویر کھینچتے ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف ہے۔ اگر اشراق خطا پذیر نہ ہوتا تو یہ اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

درحقیقت انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی کوئی بھی اس کے حواس اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا، جو اس

---

* مصنف نے وجدان کا لفظ اشراق کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ استعمال اس اصطلاحی مفہوم سے کچھ مختلف ہے جو علم کلام اور منطق میں اس اصطلاح کو حاصل ہے۔

کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدہ میں کبھی یونانی و مصری اوہام کی تائید نظر آتی ہے اور کبھی فلسفۂ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت نظر آنے لگتے ہیں۔

پھر اگر اس حاسہ کی صحت پورے طور پر تسلیم بھی کر لی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس حاسہ کے محسوسات کیا ہیں؟ اس سے کن چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔ اہل کشف کہتے ہیں کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں، اور نہ ہی کائنات و انسان کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے۔ گویا بنیادی سوالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اشراق نہ تو ان مسائل کا کوئی واضح جواب دے سکے اور نہ کوئی مفصل اور مثبت نظام زندگی پیش کر سکے۔ خود اپنی زندگی گزارنے کے لئے بھی انہیں اپنے ہی زمانے کے نظام کی اقدار مستعار لینی پڑیں۔ چنانچہ ہیراکلس * اگر مصری رسوم دینی اور مذہبی تقریبات کا پابند تھا تو جولین: رومی بت پرستی کا۔ ویسے دونوں کا شمار اہل کشف میں کیا جاتا ہے۔

اس مختصر بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں، اس کے حواس، اس کی عقل اور اس کا حاسۂ باطنی، اس کی زندگی کے اہم اور بنیادی سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان سوالات کے جواب کی کوئی راہ ہی نہیں۔ ان سوالات کا حل پیش کرنے کا دعویدار ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو رسول اور نبی کہتا ہے اور اپنا ذریعۂ علم وحی بتاتا ہے۔ چنانچہ آیئے وحی اور رسول کی روایت کو بھی پرکھ کر دیکھیں کہ ان کا کیا مقام ہے۔

۴۔ **وحی**: وحی نام ہے اس علم کا جو خداوند تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں پر انسانوں کی ہدایت و معرفت کے لئے منکشف کرتا ہے۔ دوسرے تمام انسانوں تک یہ علم روایت اور نقل کے ذریعہ سے پہنچتا ہے۔ چنانچہ وحی یا بالفاظ دیگر رسالتی علم سے متعلق تین باتیں خصوصی ہیں

(۱) اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ تمام طور پر ان اشیاء سے متعلق ہوتا ہے جو ظاہری حواس سے مخفی ہیں۔

(ب) اس علم کا ذریعہ عام ذرائع علم سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں نہ ادراک حسی ہوتا ہے۔ اور نہ استدلال منطقی۔ بلکہ ایک ناقابل بیان پیرایہ میں نبی یک بیک نئے حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے زیادہ واضح ہوتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں۔

(ج) الہامی علوم اشراقی علوم کی طرح بے معنی اور معاشرتی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی ہی کی ہدایت اور شرح کے لئے ہوتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ایک عملی نظام حیات کی بنیاد بنتے ہیں۔

آیئے اب ان تینوں کو ذہن میں رکھ کر یہ غور کریں کہ ان میں سے کون سی خلاف عقل اور غیر منطقی ہے۔ کیا وحی کا مابعد الطبیعاتی اشیاء سے علم فراہم کرنا غیر معقول ہے؟۔ اگر مابعد الطبیعاتی اشیاء ہیں، جیسا کہ عقل عام اشارہ کرتی ہے کہ ہیں، تو پھر ان سے متعلق علم بھی یقینی ہوگا۔ کیا وحی کا ایک خاص طریقہ پہ وارد ہونا غیر منطقی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں ہر جانب انسان کی ضرورتوں اور آسائشوں کی تکمیل کا سامان بکھرا ہوا ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور حقیر سے حقیر حاجت بھی ایسی نہیں جو اس دنیا میں پوری نہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مہربان آقا نے انسان کی تمام ضروریات اس کائنات میں مہیا کر رکھیں ہیں۔ لیکن اس دنیا میں عام انسان کی سب سے اہم ضرورت۔ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل۔ بظاہر موجود نہیں۔ عقل اشارہ کرتی ہے اور فہم مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مہربان آقا جس نے ہر ضرورت کا سامان تکمیل بخشا یہ نہیں کر سکتا کہ اس عظیم ضرورت کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دے اور چونکہ ضرورت عام طریقہ سے پوری نہیں کی جاری ہے اس لئے یقیناً اس کے لئے کوئی خاص طریقہ مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ بات خلاف عقل ہے کہ الہامی علوم نظام زندگی کی بنیاد ہیں؟ جب وحی متعلق ہی ان اشیاء سے ہے جو عین حیات ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وحی کا انکشاف کردہ علم بھی زندگی کی ہدایات و قیادت کے لئے ہوگا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ الہامی علوم عملی طور پر بعض معاشروں کے نظامات زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

وحی کی حقانیت: اب جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ وحی کسی طور پر بھی خلاف عقل و دانش

نہیں تو ایک عاقل و دانش مند کے لئے یہی مناسب ہے۔ کہ وہ الہامی علوم کی اسی طرح پرکھ کرے۔ جیسے دیگر روایتی علوم کی کی جاتی ہے اور اگر یہ علوم پرکھنے پر صحیح ثابت ہوں تو ان پر ایمان لائے۔

جب کسی شخص کے قول کی تصدیق یا تکذیب کرنی مقصود ہوتی ہے تو ہمارے پیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک قول و نقل کرنے والوں کی شخصیت اور دوسرے قول کے معنی۔ آیئے انہی دو کسوٹیوں پر ہم رسول کے دیئے ہوئے علم کو بھی پرکھیں۔

کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف نہ جاتا ہو۔ اگر کوئی شخص ہاتھی کو ہوا میں اڑتا اور چیل یا کبوتر کو پانی کی سطح کے نیچے تیرتا بتاتا ہے؛ تو اس کا قول قابل اعتبار نہیں۔ اس لئے کہ عام انسانی مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ لیکن نبی جو چیزیں بتاتا ہے وہ یا تو مابعد الطبیعاتی ہیں اور اس لحاظ سے تجربہ اور مشاہدہ کی قلمرو سے باہر ہیں یا عقل و حواس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ میں کسی نبی نے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جو خلاف عقل ہو۔ ہاں ماورائے عقل بہت سی باتیں کہی گئیں۔

قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ ایک گروہ کے افراد جو ایک ہی قسم کی اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہوں ان کے اقوال آپس میں ٹکراتے نہ ہوں۔ انبیائے کرام کی تعلیمات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں تضاد نہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصول و مبادی ایک ہی ہیں

قول کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ اس کو عملی زندگی میں اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ اگر یہ نتائج خوشگوار اور انسانیت کے حق میں مفید ہیں تو گمان غالب ہے کہ قول صادق ہوگا اور بصورت دیگر باطل۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بھی انبیاء کی تعلیمات کو قبول حاصل ہوا۔ انسانی معاشرہ کی بیشتر خرابیاں دور ہو گئیں اور وہ بہت جلد عدل و انصاف کی نعمتوں سے ہم کنار ہو گیا۔

قول کو جانچ لینے کے بعد قول نقل کرنے والے کی باری آتی ہے۔ ان دیکھی چیز سے متعلق قول کی تصدیق یا تکذیب کرنے کے لئے راوی کی شخصیت کی پرکھ اور بھی ضروری ہے۔ قول کی صداقت پر دو صورتوں اثر پڑ سکتا ہے ایک شعوری اور دوسرے لاشعوری۔

قول کو مسخ اور غیر معتبر سمجھے جانے کی ایک صورت وہ ہے کہ جب راوی بد دیانت اور بدکار ہو۔ ایسا شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے یا تو اقوال گھڑ سکتا ہے۔ یا ان کو مسخ شدہ صورت میں پیش کر سکتا ہے۔ لیکن انبیاء کے بارے میں ان کے دشمنوں کو بھی اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ وہ بلند کردار اور راست گو ہیں۔

قول کا مسخ ہو جانا لاشعوری طور پر بھی ممکن ہے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ راوی کے حواس درست نہ ہوں۔ لیکن انبیاء کے بارے میں یہ حقیقت بھی مسلم رہی ہے کہ وہ سلیم العقل، صحیح الدماغ اور صاحب الرائے ہوتے ہیں۔

لاشعوری تنسیخ و تبدیلی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قول راوی کے زمانے کے تکنیکی علوم سے متاثر ہو۔ لیکن ہر نبی اگرچہ تمام اشیاء سے متعلق کما حقہٗ معلومات رکھتا ہے۔ لیکن وہ تکنیکی اور ادبی علوم سے ناواقف ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے اپنے یا کسی دوسرے زمانے کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً کسی غیر معمولی ذریعہ سے اس پر منکشف ہوئیں اور بغیر کسی تبدیلی کے اس کی زبان سے جاری ہو گئیں۔

مذہب اور تمدّن

اوپر کی بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ زندگی کے بنیادی مسائل کے حل کی واحد صورت دین اور رسالت ہے۔ یہ نہ تو دیگر علوم کی طرح مادی اشیاء تک محدود ہیں اور نہ خطا پذیر ہیں۔ اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ وحی اور الہام کی بناء پر جو تمدن تعمیر ہوتا ہے وہ کسی حد تک ان نظام ہائے حیات اور تمدنوں سے مختلف ہوتا ہے وہ کسی حد تک ان نظامہائے حیات اور تمدنوں سے مختلف ہوتا ہے جو حواس، عقل اور اشراق کی بناء پر وجود میں آتے ہیں۔ آیئے پہلے آخر الذکر تین کا مطالعہ کریں۔

۱۔ حسی تمدن۔ ✱ حسی تمدن انسانوں کا مقبول ترین تمدن ہے۔ اس سے زیادہ سہل اور اس سے زیادہ انسانی خواہشوں کی تکمیل کرنے والا کوئی اور نظام نہیں۔ حسی تمدن کی بنیاد حواس اور اس کے فیصلوں پر ہے۔ حواس سے چونکہ صرف مادی اشیاء کا ادراک کیا جا سکتا

ہے اس لئے حسی تمدن کے نزدیک صرف وہ اشیاء حقیقی ہیں جو قابل ادراک ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ وہم کا نتیجہ ہے۔ نہ کسی غیر مادی خدا کا کوئی وجود ہے اور نہ حیات دموت کی کوئی حقیقت۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی بناء پر انسان اپنے اعمال میں کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہو جاتا ہے۔ وہ من مانی کارروائی کرتا ہے اور اس عمل کا مرتکب ہوتا ہے جو اس کے اپنے نفع میں ہو۔ اسے اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ اخلاقی طور پر وہ عمل جائز ہے یا ناجائز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کا معیار ہی ذاتی نفع اور لذت نفس قرار پاتے ہیں اور وہ عمل جائز ٹھیرتا ہے جس سے جسمانی آرام اور مسرت حاصل ہو۔

حسی تمدن کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انسان حاضر کو غائب کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے۔ اس کا مقصد سطحی منافع کا جلد از جلد حصول قرار پاتا ہے۔ اسی بناء پر حسی تمدن کا ہر شخص مضبوط کردار سے عاری ہوتا ہے اس میں صبر اور اخلاقی جرأت کا مادہ نہایت کمزور ہو جاتا ہے اور اس کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اسی نظریۂ اخلاق اور طرز فکر کی بنا پر معاشرہ مختلف بد اخلاقیوں اور ظلم و ناانصافی کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ حسی تمدن پر کاربند اقوام کبھی اہل مدین کی طرح کم تولنے اور بے ایمانی کو جزو زندگی بنا لیتی ہیں اور کبھی قوم لوط کی طرح حیوانی جذبہ کی تسکین میں حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ آج بھی حسی تمدن اور مادی طرز فکر کے مظاہر ریس، کلب، ناچ گھر، شراب خانے اور قمارخانے ہیں۔ جو انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مضر اور رکیک جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حیثیت معاشرہ میں اب مستقل سماجی اداروں کی ہے

حسی تمدن جب کسی ایسی قوم کے درمیان پرورش پاتا ہے جسے اپنی اجتماعیت کا کچھ زیادہ احساس ہوتا ہے تو معیار اخلاق لذتیت کے بجائے افادیت قرار پاتا ہے یعنی شخصی مسرت کے بجائے پوری قوم کی یا قوم کے زائد سے زائد افراد کی مسرت مقصود ہوتی ہے۔ اس صورت بھی حسی تمدن انسانیت کے حق میں تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے پہلے اگر ایک ہی معاشرہ کے افراد ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ تو اب قوم۔ قوم

سے برد آزما ہوتی ہے۔ ہر قوم اپنے معاشی اور مادی مفاد کے لئے دوسری اقوام پر ظلم و زیادتی کرنا اپنا مسلک بنا لیتی ہے۔ اس طرح قوم و ملک کی عظمت کے نام پر انسان، انسان کا خون بہاتا ہے۔ اگر دورِ جاہلیت میں عرب قبائل محض اس لئے ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہتے تھے کہ اپنے قبیلہ کا نام روشن کریں تو آج کے روشن دور میں بھی حسی تمدن کے علمبردار اپنی قوم کی سرخروئی اور عظمت کی خاطر دو عظیم جنگوں میں کروڑوں انسانوں کا خون بہا چکے ہیں اور ان دو جنگوں میں مرنے والوں کی تعداد انسانی تاریخ کی باقی تمام جنگوں میں مقتولین کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھی۔

۲۔ **عقلی تمدن**۔ خالص عقلی تمدن کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ انسان اپنے افعال میں عاقل سے زیادہ غیر عاقل ہے۔ عقل سے بڑھ کر جذبات عمل کی بنیاد ہیں۔ ایسے تمدن جو عقلی کہلاتے ہیں صرف جزوی یا سطحی طور پر عقلی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرت و سماج تو دور کی چیزیں ہیں خود فلسفہ بعض اوقات عقلی نہیں رہتا۔ افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفہ جو عقل کی اہمیت و عظمت کے معترف تھے بہت سے نظریات میں یونانی اوہام کے پیرو تھے۔ مزید یہ کہ عقل، بجائے جذباتی اور وہمی اجزائے تمدن کی تنقید کرنے کے، خود ان کی موافقت میں دلائل تلاش کرتی ہے اور اس کو اپنے حسی تمدن کا آلہ کار بنا لیتی ہے۔ چنانچہ یونانی حکیموں نے اپنے زمانے کی ان تفریحات کے لئے، جن سے بڑھ کر خون آشامی اور شقاوت کا فعل نہیں ہو سکتا، کیا کیا تاویلات نہیں کیں اور اس کی معصومیت پر کیسے کیسے دلائل قائم نہیں کئے۔ جاہلیت عرب کی رسم دختر کشی اور ہندوستان کی ستی کی رسم سے متعلق اس زمانے کے عقلاء نے کیا فلسفے نہ تراشے ہوں گے۔

یورپ کے موجودہ تمدن کو عقلی اور علمی تمدن سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں عقل کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ حسی تجربات پر صاد کرے اور حسی خواہشات کی تکمیل میں ممد و معاون ہو۔

۳۔ **اشراقی تمدن**: اشراق حواس پرستی اور مادیت کی بالکل ضد ہے۔ حواس پرستی میں جس طرح روح اور اس کے متعلقات کا انکار کیا جاتا ہے یا ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے اشراق میں جسم اور مادیت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسان کا جسم

ایک قفس ہے جس میں طائر روح مقید ہے۔ وہ قفس اس کی ہر قسم کی ترقی اور پرواز میں حائل ہے۔ روح اپنے مرکز اصلی اور سر چشمۂ حقیقی سے اس وقت تک اتصال پیدا نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس قفس سے آزاد نہ ہو۔ اس لئے یا تو قفس توڑ دیا جائے یا اس کی تیلیوں کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ طائر روح جب چاہے آزادانہ اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کر سکے۔

اس فلسفہ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسم اور اس کے متعلقات سے غفلت برتی جائے۔ مادیت کا ہر طرح ازالہ کیا جائے اور تجرد و رہبانیت کی زندگی اختیار کی جائے۔ چنانچہ جن مذاہب اور اخلاقیات پر اس اشراقی فلسفہ کا اثر پڑا ان کا تمدن اسی رنگ میں رنگ گیا۔ ایسے تمدن کی سب سے بڑی مثال دورِ وسطیٰ کا مسیحی یورپ ہے۔ مسیحیت بہت جلد مذہب عیسوی کے نمائندوں اور علمبرداروں کی کج فہمی کی بناء پر اشراقیت سے زیادہ راہبانہ اور غیر فطری نظام بن گئی۔ خواتین کے وجود کو دنیا کے لئے لعنت اور دینی ترقی میں سب سے بڑا مانع سمجھا جانے لگا۔ شہروں کو اجاڑ کر صحراؤں میں زندگی بسر کرنا معراج انسانیت خیال کیا جانے لگا۔ جسم کشی، خود آزادی اور خلاف فطرت ریاضتوں کے جو لرزہ خیز واقعات لیکی نے تاریخ یورپ * میں نقل کئے ہیں ان سے ان بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو مسخ شدہ مسیحیت نے انسانیت و تمدن کے حق میں کیں۔

اس مردم بیزار اور مردم آزار نظام روحانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسوی سلطنت اور مذہب کا جہاں جہاں اثر تھا وہاں تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملک کی آبادی سرعت کے ساتھ گھٹنے لگی۔ امراض، اموات اور قحط سالیوں کی کثرت ہوئی۔ تعلیم فنا ہونے لگی۔ شہریت کے آثار مفقود ہونے لگے۔ وسائل حیات برائے نام رہ گئے۔ اور پوری مسیحی دنیا میں جہالت، وحشت اور تاریکی کا دور دورہ ہو گیا یہاں تک کہ قرونِ وسطیٰ، قرونِ مظلمہ کا ہم معنی قرار پایا۔

زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام

آپ نے دیکھا کہ محض حواس، عقل یا اشراق ایک مکمل و متوازن معاشرہ قائم کرنے میں کس طرح ناکام رہے۔ آیئے اب ہم دریافت کریں کہ وحی و الہام کس طور پر ایک ایسا معاشرہ

ترتیب دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جو عدل و انصاف سے معمور ہو۔ الہامی معاشرہ کی اساس وہ حل ہوتا ہے جو انبیاء کرام زندگی کے بنیادی مسائل متعلق پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ الہامی تمدن کے مطالعہ سے پیشتر ان تعلیمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انبیائے کرام کی تعلیمات، جو قرآن پاک میں محفوظ ہیں، زندگی کے بنیادی مسائل کا مندرجہ ذیل حل پیش کرتی ہیں۔

ا۔ **انسان اور اس کی زندگی**: انسان اور اس کی زندگی سے متعلق چار اہم نکات واضح کئے گئے ہیں۔

اول: انسان خدا کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

دوم: وہ اشرف المخلوقات ہے۔ یعنی محض حیوان ناطق نہیں بلکہ دیگر مخلوقات پر اخلاقی برتری رکھتا ہے۔

سوئم: انسان کی زندگی خدا کی عبادت کے لئے ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ تمام شعبہائے زندگی میں خدا کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو۔ خواہ یہ سجود و قیام ہو خواہ تجارت و سیاست۔

چہارم: انسان کی موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے۔ جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہٗ	پس جس نے ذرہ برابر بھلائی کی وہ دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی وہ بھی دیکھ لے گا۔
ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہٗ	

ب۔ **کائنات کی حقیقت**: کائنات سے متعلق تین نکات قرآن پاک میں واضح کئے گئے ہیں۔

اول: انسان کی طرح ہر شے خدا کی تخلیق کردہ ہے۔ **دوئم**: اس کائنات کا نظام خدا کے تعین کردہ اصول (سنت اللہ یا فطرت) کے مطابق چل رہا ہے **سوئم**: یہ دنیا انسان کے استعمال اور تصرف کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح انسان کے لئے آزمائش کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔

ج۔ خُدا اور اس کی صفات: خدا اور اس کی صفات سے متعلق قرآن پاک کے صفحات بھرے ہوئے ہیں جن کا اعادہ اس مختصر باب میں ممکن نہیں۔ صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول: خدا وہ ہستی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مدبر اور آقا ہے۔ خدا نہ جسم رکھتا ہے اور نہ جسمانی حاجات۔ چونکہ اس کی مثال موجود نہیں اور چونکہ اس کی ذات کا ادراک حواس کے لئے ممکن نہیں اس لئے خدا کا کوئی واضح تصور کوئی ذہن انسانی ترتیب نہیں دے سکتا۔

خدا خالق و آقا ہونے کے ساتھ عادل و رحیم بھی ہے۔ اس کی صفات ربوبیت، عدل اور رحم ہی کی بناء پر کائنات میں تنوع کے ساتھ ساتھ توازن و اعتدال ہے۔ صفت عدل ہی کی بناء پر وہ اپنے بندوں پر وحی کے ذریعے راہ معرفت منکشف کرتا ہے اور اسی کی بناء پر یوم آخر میں اچھے اور برے کام کا بدلہ دے گا۔

اب ذرا اسی الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ ان کا انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و اجتماع پر کیا انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے اس عالم سے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ نہ تو بے بادشاہ کی سلطنت ہے اور نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت۔ بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے۔ جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور مدبر و حکم بھی۔ اس کا سب سے پہلا اثر ذہن انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے قبائل اور اقوام کی تقسیم ظاہری اور سطحی معلوم ہونے لگتی ہے اور انسانیت کے ایک وحدت ہونے کا یقین راسخ ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں زندگی کے بامقصد ہونے کا خیال اور آخرت کا احساس عمل کی اصلاح کا عظیم ذریعہ بنتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ عیش و تفریح میں وقت ضائع کرنا برا معلوم ہوتا ہے ظلم و ناانصافی سے طبیعت گھبراتی ہے۔ احساس ذمہ داری بڑھ جاتا ہے۔ انسان کا قتل تو بہت بڑی چیز ہے معمولی ایذا رسانی بھی انسانی ضمیر پر بار گزرتی ہے۔

خلافت اور نیابت کا تصور حاکم کو من مانی کارروائی سے باز رکھتا ہے۔ وہ اپنے کو مخلوق خدا کا

مالک اور آقا نہیں بلکہ خدا کا آمین اور بندوں کا خادم سمجھتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اسی فکر میں رہتا ہے کہیں اس کے ملک میں ظلم و زیادتی رہ نہ جائیں۔ عدل و انصاف کے نفاذ کے لئے وہ ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ تصورات خلافت اور آخرت سے جو احساس ذمہ داری انسانی ذہن پیدا ہوتا ہے اس کی چند مثالیں الہامی تمدن کے دو ادوار سے پیش کی جاتی ہیں۔

ایک جلیل القدر خلیفہ۔ جو اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حکمران تھے، موٹا جھوٹا پہنتے اور روکھا سوکھا کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سب مسلمان یہ کھاتے ہیں یا کھا سکتے ہیں۔ جب جواب نفی میں ملتا تو کھانا واپس کر دیتے۔

کسی گھوڑ دوڑ میں ایک مصری نے کہا " واللہ میرا گھوڑا آگے ہے "۔ قریب ہی گورنر مصر کا ایک بیٹا بھی گھوڑا دوڑا رہا تھا اس نے مصری کے یہ کہنے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا " لو ایک شریف زادہ کا یہ طمانچہ " اس مصری نے مدینہ پہنچ کر خلیفہ سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے لڑکے کو مدینہ طلب کیا۔ جب وہ آگئے تو مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور کہا " مار اس شریف زادے کو " جب وہ لڑکے کو مار چکا تو کہا " اب یہی کوڑا باپ کے سر پہ گھما، اس لئے کہ اس لڑکے نے تجھ کو جو طمانچہ مارا تھا وہ محض اپنے باپ کی حکومت کے گھمنڈ میں مارا تھا " پھر آپ نے گورنر سے کہا " تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا حالانکہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے "

ایک اور خلیفہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی تھی۔ اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے۔

یہ ہے وہ مختصر سا خاکہ جس پر الہامی تمدن قائم ہوتا ہے۔ اس میں نہ حسی تمدن کی اغراض پسندی ہوتی ہے اور نہ اشراقی تمدن کا ترک دنیا۔ نفع پرستی کے بجائے چند مستقل اخلاقی اصول ہیں جو وسیع تر انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مفید ہیں اور جن کی پابندی ہر صورت میں ضروری ہے۔ خواہ حالات سازگار رہیں یا ناسازگار۔ اس کی تعلیم یہ نہیں کہ ؏

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز بلکہ یہ ہے ؏

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

ترک دنیا اسلام کی نظر میں ایسا ہی برا ہے جیسا دنیا کی مصروفیات میں غرق ہو جانا اور خدا

کو بھول جانا۔ اسلام معاشرتی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے ۔اس کی بیخ کنی نہیں۔ اس لئے اس نے صاف طور سے کہہ دیا کہ لا رہبانیۃ فی الاسلام (اسلام میں رہبانیت نہیں)۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ ان تمام برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ جو نفس کشی اور آدم بیزاری کا لازمی ثمر ہیں

اوپر کی پوری بحث سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ :۔

۱۔ عقلی تنقید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل صرف وحی اور رسالت کے ذریعہ ممکن ہے۔

۲۔ ان مسائل کے مختلف جوابات پر تمدن کی جو عمارت تعمیر ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے مستحکم اور صحت مند اور لیاقت بخش وہ تمدن ہے جس کی بنیاد وحی والہام پر ہے۔

مذہب کی ضرورت

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک کوئی زمانہ مذہبی احساس و شعور سے خالی نہیں رہا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں نے مختلف مذاہب اختیار کئے لیکن مذہب کے فی نفسہٖ وجود اور اس کی ضرورت سے انسانوں نے بحیثیت مجموعی کبھی انکار نہیں کیا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مذہب انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جس طرح انسان دوسرے عواطف اور جذبات لے کر پیدا ہوا ہے اسی طرح اس میں ایک مذہبی جذبہ بھی روزِ ازل سے موجود ہے۔ یہ اسی مذہبی جذبہ کا اثر ہے کہ وہ اشخاص جو بظاہر خدا کی ہستی اور اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں مصیبت میں بے اختیار خدا کو پکار اٹھتے ہیں۔" اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں، ÷۔ مذہب درحقیقت ایک ایسے احساس پر مبنی ہے جو ایک طرف انسان کو اپنی بے چارگی کا تصور دلاتا ہے اور دوسری طرف ایک ایسی ہستی کے تصور سے انسان کو روشناس کرتا ہے جو بے کراں ہے۔ یہ احساس انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس بے کراں ہستی کے سپرد کر دے، اس کے ساتھ تعلق پیدا کرے اور ان قوانین کی اطاعت کرے جو ہستی انسانی وجدان کو عطا کرتی ہے پس مذہب انسان کے اسی طرح ساتھ ہے جس طرح اس کی عقل یا دوسرے عواطف۔ اس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر، طوعاً و کرہاً، کسی ترقی یافتہ یا ابتدائی مذہب کو بہر صورت ضروری ماننا پڑے گا۔ وہ لوگ بھی جو مذہب کے انکاری ہیں (اور ایسے لوگ شاذ ہی ہیں) اپنی زندگی میں کسی فوق الفطرت ہستی کا اقرار کرتے ہیں یا اس سے بچنے کے لئے خود

فطرت کو ایک ماورائی تصور تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کو وہی درجہ عطا کر دیتے ہیں جو مذہب خدا کو دیتا ہے۔

مذہبی احساس انسان کا پیدائشی جذبہ ہے۔ اس کا علم ہم کو خود اپنی ذات کے شعور سے ہو سکتا ہے۔ ہر انسان جب بھی غور و فکر کی ابتداء کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کچھ سوال ابھرتے ہیں۔ وہ خود کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ کیا اس کو کسی نے اسی طرح پیدا کیا ہے اور بنایا ہے جس طرح خود انسان نے اپنے استعمال کی بہت سی چیزیں بنائی ہیں؟ کارخانہ قدرت کس طرح چل رہا ہے؟ یہ زمین و آسمان، یہ مہر و ماہ، یہ ثوابت و سیارات کہاں سے آئے؟ فلسفہ اور مذہب دونوں ان ہی سوالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سوالات انسانی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ اور یہ خود اس بات کے ضامن ہیں کہ ان کے جواب ممکن ہیں۔

افلاطون نے سچ کہا تھا کہ فلسفہ طفل حیرت ہے۔ انسان جب اس حیرت سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اپنے آپ کو بیش بہا نعمتوں سے مالا مال دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ایک جذبۂ تشکر پیدا ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب کا تصور ناگزیر طور پر ابھرتا ہے کوئی شخص چاہے خدا کو جانے یا نہ مانے، جس آن وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ "ہم کو کیا ہی اچھی نعمتیں ملی ہیں"، اسی وقت وہ اپنا تعلق اپنے رب سے استوار کر لیتا ہے۔

لیکن مذہب دوسرے جذبات اور عواطف کی طرح محض ایک جذبۂ موہوم ہی نہیں ہے اگر یہ صرف ایک جذبہ موہوم ہوتا تو مختلف مذاہب میں کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہتا اس لئے کہ یہ جذبہ حضرت آدم کی دعا، ویدوں کی تعلیم، بدھ کے نروان، کنفیوشس کی تعلیمات اور اسلام میں ایک ہی طرح کار فرما ہے۔ پھر اسلام، اور غیر اسلام میں کیا فرق باقی رہا؟ مذہب در اصل طلب اور تسکین طلب کے امتزاج کا نام ہے۔ جس طرح اس کائنات میں انسان کے ہر جذبہ اور ضرورت کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ اسی طرح اس مذہبی جذبہ کو تسکین کے ذرائع مہیا ہوئے ہیں۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ انسان میں ودیعت شدہ تمام جذبات کا ایک مقصود تو اس کائنات میں موجود ہو اور مذہبی جذبہ کا نہ ہو۔ تاریخ ہمیں تبلاتی ہے کہ ہر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ آتے رہے ہیں جنہوں نے انسان کو الہامی ہدایات سے نوازا

ہے۔ گویا وہ انسانیت کی اس پکار کا جواب ہیں کہ مذہب کے بغیر ہماری فطرت نا تمام ہے۔
اس ہستی نے جس کی طلب انسان کے دل میں روز ازل سے جاگزیں تھی۔ اس کی اس پکار کو سنا
اور اس کا جواب پیغمبروں کی صورت میں نازل کیا۔ خدا کے بھیجے ہوئے ان پیغمبروں نے انسان کو
شرف انسانیت بخشا، اس کی ہستی کی تکمیل اور ان کو ان کا مذہب عطا کیا۔ ان معنوں میں مذہب
درحقیقت انسان کی دلی طلب کے جواب میں نازل شدہ ہدایات کا نام ہے۔ مذہب یہاں
احساسات سے نکل کر تعلقات کے دائرے میں قدم رکھتا ہے اس مقام پر صرف ایک موہوم طلب ہستی
ایک موہوم جذبہ کی تسکین کا باعث ہی نہیں ہوتی بلکہ انسان فہم و فکر میں آنے والی ایک ہستی
کے وجود کا اقرار کرتا ہے جو اس کو قوانین زندگی عطا کرتی ہے۔ ان قوانین پر انسانی فراست صاد
کرتی ہے اور وہ اس کی زندگی کے لئے بہ اعتبار نتائج اتنے ہی مفید ثابت ہوتے ہیں جتنے کہ
دوسری فطری اور اخلاقی قوانین۔

مذہب کی حقیقت ان قوانین پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ انسان کو ایک ایسا کلی نقطۂ نظر
بھی دیتا ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ یہ تصور کائنات کی ہر چیز کو ایک خاص
انداز سے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں ہر شے میں ایک نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ذرہ سے لے
کر آفتاب تک، انسان سے لے کر ادنیٰ ترین عضویہ تک، ایک ایسے خلاق عالم کی نشان دہی کرنے
لگتے ہیں، جس نے ان تمام اشیاء کو پیدا کیا اور ان کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہاں کی ہر شے
پھر ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے انفس و
آفاق کی تمام نشانیاں ہستی الٰہی کا پتہ بتلاتی ہیں اور زمین و آسمان کی ہر شے زبان حال سے تسبیح
خداوندی میں مصروف نظر آتی ہے۔

یہ نقطۂ نظر انسان کی رہنمائی اس کی پوری زندگی میں کرتا ہے اس کے اخلاق کی بنیادیں
اسی نقطۂ نظر پر استوار ہوتی ہیں۔ اس کی معاشرتی اور معاشی زندگی اسی تصور سے ہدایت پاتی
ہے۔ اس کی سیاست، اس صلح و جنگ اس کی دوستی و دشمنی سب پھر اسی فلسفۂ حیات کی تابع ہو جاتی ہیں
اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود رہے ہیں جو مذہب کے سرے
سے انکاری ہیں۔ لیکن جس طرح ہر قانون استثنا مذہب پر بھی حاوی ہے۔ قوت گویائی انسان کا

فطری خاصہ ہے مگر بعض انسان مادر زاد گونگے پیدا ہوتے ہیں۔ مہذب اور صاحب علم گھرانوں اور قوموں میں بعض اشخاص ناقابل تعلیم نکل آتے ہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ پوری قوم کسی خاص جذبۂ فطری سے عاری نظر آتی ہے۔ اسی طرح بعض آدمی مذہبی احساس سے بے بہرہ پائے جاتے ہیں۔ اور جس طرح گرد و پیش کے حالات سے بعض آدمی اپنی قوت گویائی اور دیگر قوی کو زائل کر دیتے ہیں یا بعض قومیں ترقی سے تنزل کی طرف آجاتی ہیں، اسی طرح کسی زمانے میں محض جسمانی اور مادی تعلیم کا زور رہنے اور روحانی تاریکی اور جہالت پیدا ہو جانے سے مذہبی جذبہ مردہ ہو جاتا ہے اور تمام فضا میں دہریت کی ہوا پھیل جاتی ہے، اگر جب عقل و ترقی کے زائل ہونے پر اس کے داخل فطرت ہونے سے انکار نہیں کیا جاتا تو انصاف کی رو سے مذہب کو خارج فطرت یا اکتسابی کہنا بھی روا نہ ہوگا

مشہور برطانوی مفکر جیمز اسٹورٹ مل نے اپنے تین لیکچروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب ایک فطری داعیہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مذہب کے اثر سے بچ نہ سکا۔ اور اور مذہب انسانیت ؛ کے نام سے اس نے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی جس میں بجائے خدا کے ماننے کے نوعِ انسانی کی ہمدردی کو مقصد اعلیٰ قرار دیا۔ بات وہی ہے کہ سب سے اعلیٰ ہستی اور سب سے اعلیٰ خیر کی تلاش دل میں موجود ہے لیکن مل کی نظر محض دنیا تک محدود ہے۔ وہ یہیں کی اعلیٰ ترین ہستی یعنی انسان کو معبود گردانتا ہے اور یہیں کے اعلیٰ فائدوں یعنی اخلاق حسنہ کو معراج کمال سمجھتا ہے۔

انیسویں صدی کے فرانسیسی مفکر اگست کومت کا یہ خیال صحیح ثابت نہیں ہوا کہ مذہب کا زمانہ نئے سائنسی طریق فکر کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہب انسانی فکر کی اولین منزل ہے۔ دوسری منزل فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی ہے، اور تیسری سائنسی۔ اس کے باوجود کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں مابعد الطبیعیات اور مذہب دونوں سے بے توجہی اور گریز کا ایک عام جذبہ پیدا ہو گیا تھا اس دور میں بھی مذہب اور فلسفہ کا نہ صرف یکہ زندہ رہنا بلکہ ان کا بار بار اعادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سائنسی طریق کار اور تصور مذہب اور فلسفہ کی جگہ نہیں لے سکتا۔ دو عظیم جنگوں کے بعد خصوصاً یورپ اور امریکہ میں مذہبی رجحانات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ سائنسی ترقی کے باوجود مذہب کی کمی بیسویں صدی کے انسان شدت سے محسوس کی ہے۔ اور اب

پھر مذہبی لٹریچر دنیا میں غالباً دوسرے تمام اقسام کے لٹریچر سے زیادہ پیدا ہو رہا ہے، قومیت اور لادینی جمہوریت کے نام پر انسان نے جس بہیمیت کا ثبوت ماضی قریب کی تاریخ میں دیا ہے اس کے خلاف انسان کے دل میں نفرت پیدا ہو رہی ہے اور مذہبی احساسات اور جذبات اس کی جگہ لے رہے ہیں۔ دنیا میں اس وقت سوویت روس کے علاوہ اور کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں پر شعوری طور پر چند لوگ خدا اور مذہب کے تصورات کو ذہن بدر کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ کوشش ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تصورات انسانی ذہن سے بالکل جدا نہیں کئے جا سکتے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو مذہب کے انکاری ہیں، مذہب کے خلاف کوئی قوی دلیل دستیاب نہیں ہوئی۔ جس سے وہ مذہبی تصورات کا باطل ہونا ثابت کر سکیں۔ منکرین خدا یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ذہن میں خدا کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔

مغرب کا پورا فلسفہ جو فلسفۂ جدید کہلاتا ہے اور جو قرون وسطیٰ کے مذہبی فلسفہ کے خلاف رد عمل کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ مذہب سے بغاوت پر مبنی نہیں ہے جدید دور کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے فلسفی نے اپنی اپنی دانست میں خدا کے وجود اور مذہب کی ضرورت پر دلائل فراہم کئے ہیں۔ مذہب کے متعلق ان دونوں ادوار کے نقاط نظر میں فرق ضرور ہے لیکن جدید مفکر مذہب کی ضرورت سے بے نیاز نہیں معلوم ہوتے۔ موجودہ فلسفہ اور سائنس نے چند ایسے نظریات کی پشت پناہی ضرور کی ہے جن کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مذہب کی انسانی زندگی میں عقلاً کوئی جگہ باقی نہیں رہتی ان میں پہلا نظریہ مادیت کا فلسفہ ہے۔ اور آگے بڑھنے سے پہلے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

فلسفہ مادیت

فلسفۂ مادیت ہم کو ایک ایسا مربوط نظام دیتا ہے جو کائنات اور اس کے تمام مظاہر کو جواہر کو اور ان کی حرکات میں تحلیل کر دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جب ہم ان جواہر کی حقیقت اور ان کی حرکت کے قوانین پر پورے طور سے حاوی ہوں گے تو اس دنیا کے سارے اسرار ہم پر روشن ہو جائیں گے طبیعاتی

علوم نے اتنا تو ہم کو بتلا ہی دیا ہے کہ حرارت، روشنی، بجلی، مقناطیس وغیرہ کے بظاہر مختلف النوع مظاہر درحقیقت ایک ہی مشترک توانائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک دوسرے میں تحویل ہو سکتے ہیں۔ کیمیائی مظاہر بھی اس نقطۂ نظر کے تحت اپنی حقیقت میں طبیعاتی اور میکانکی ہیں۔ گو حیات کے بارے میں ابھی تک سائنس داں کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ لیکن ان کے نقطۂ نظر سے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ خود حیات بھی ایک قسم کا کیمیائی یا طبیعاتی عمل ہو اور اس کے پیچھے بھی میکانکی اصول کارفرما ہوں۔ جب روشنی اور مقناطیس جیسے مختلف قسم کے مظاہر ایک ہی مشترک توانائی کا مظہر ہوں، جب نباتات اور حیوانات کی زندگی اس کیمیائی عمل اور ردعمل سے پیدا شدہ توانائی پر منحصر ہو جس کی مدد سے وہ غذا اور ہوا کو جذب کرتے ہیں، تو اس کا امکان ہے کہ زندگی خود بھی ایک میکانکی عمل ہو۔ سائنس دانوں کے قول کے مطابق "مایہ حیوانی" محض چند کیمیائی اجزا سے مرکب ہے۔ یہی مایہ حیوانی اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ ترین قسم کے حیوانات میں حیات کی بنیادی اکائی ہے اور سب میں مشترک ہے۔

یہ بات بھی ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ تخیل اور شعور انسانی بھی مادی اور کیمیائی عمل ہی ہے لیکن سائنسدان کہتے ہیں کہ کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ ہر ذہنی عمل، ہر جذبہ اور ہیجان، ہر احساس اور عاطفہ کسی نہ کسی طرح ایک طبیعاتی عمل سے متعلق ہے۔ انسانی ذہن و شعور کی ہر تبدیلی انسان کے طبیعاتی اور مادی نظام کی تبدیلیوں سے لازمی طور پر منسلک ہے۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جب ہم جواہر کی حقیقت اور ان کی حرکت کے قوانین کو کلی طور پر دریافت کر لیں گے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ حیات طبیعاتی اور کیمیائی توانائی کی ایک تحویل شدہ شکل کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس میں بھی وہی میکانکی اصول کارفرما ہیں۔ جو کیمیائی، یا طبیعاتی دنیا میں ہم کو نظر آتے ہیں۔

مادیت کا یہ نقطۂ نظر چونکہ ہماری فہم سے بظاہر زیادہ قریب ہے اور چونکہ موجودہ سائنسی ترقی کے تیشارہ سے ہمارے ذہن مرعوب ہیں لہٰذا سطحی طور پر بہت سے افراد کو یہ قابل قبول نظر آتا ہے۔ لیکن کیا یہ تصوّر صحیح ہے؟ کیا یہ فلسفہ انسانی شعور اور ذہن کے وجود کا کامیابی سے انکار کر سکتا ہے کیا انسانی ذہن اور شعور کے وجود کا تسلیم کرنا ممکن ہے؟

فلسفۂ مادیت انسانی شعور اور ذہن کو ایک وظیفۂ مادی میں تحویل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نفسیات میں کرداریت کا مدرسہ فکر اسی رجحان کا آئینہ دار ہے یہ اس اذعان پر مبنی ہے کہ جس طرح میکانکی قوت کیمیائی قوت میں تحویل ہو سکتی ہے اسی طرح کیمیائی اور میکانکی قوتیں حیوی قوت میں تحویل پذیر ہیں جو آخر الامر حیات، احساسات اور شعور کی دیگر کیفیتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں دوسری کمزوریوں کے علاوہ مادیت کا یہ تصور ایک بنیادی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ بظاہر یہ تصور اپنی ابتدا مادہ سے کرتا ہے، ذہن کو مادے کا ایک عمل قرار دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ذہن کو پہلے ہی قدم پر تسلیم کر لیتا ہے۔ جب کوئی انسان مادے کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے تو یہ اس کا ایک ذہنی عمل ہی ہے۔ یہاں تک کہ ذہن سے انکار بھی ایک ذہنی عمل ہے اس طرح اس کے انکار ہی میں اس کا اقرار پوشیدہ ہے۔ ہم مادی دنیا کے علم کی ابتدا محض معروضی حقائق سے جو ذہن سے کلیتاً آزاد ہوں نہیں کر سکتے۔ مشاہدہ کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ عمل بھی ذہنی وجود سے آزاد ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سوال کا جواب کہ کیا خارج میں ذہن سے آزاد ایک مادی دنیا موجود ہے، کبھی بھی اثبات میں نہیں دیا جا سکتا اس دنیا کا کوئی نہ کوئی تعلق ذہن سے ہونا لازمی ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں اور جس طرح بھی سوچیں ہماری فکر کا مواد، چاہے وہ خارجی مادہ ہو یا داخلی تاثرات، سب ذہن سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہیں۔

مادیت کی بنیاد ایک التباس پر ہے جس کا مشاہدہ ہم میں سے ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں کر سکتا ہے۔ ایک عام آدمی جب اپنے چاروں طرف نظر ڈالتا ہے تو اس کو بظاہر ایک ایسی دنیا نظر آتی ہے جو اس سے آزادانہ طور پر قائم ہے اور جس میں وہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان خارجی حقائق کے بارے میں اپنی معلومات مثلاً ان کا 'وجود'، 'کیفیت'، 'تعداد'، 'حالت'، 'یکسانیت' اور 'فرق' وغیرہ کو وہ معروضی حقائق تسلیم کر لیتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر 'مادہ'، 'قانون'، 'قوت' جیسے تصورات کو بھی خارجی حقائق اور تجربی تصورات تسلیم کر لیا جاتا ہے اسی طرح بہت سے مابعد الطبیعیاتی تصورات ہیں جن کو انسان اپنی سادہ لوحی سے طبیعیاتی حقائق سمجھ بیٹھتا ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اگر ہم اپنے علم کی نوعیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارا تمام علم تجربہ اور وجدان پر مشتمل ہے۔ اور یہ تجربہ محض مشاہدہ کی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اس میں

شک نہیں کہ مشاہدہ اس کا ایک اہم جزء ہے۔ لیکن انسان کے مختلف تجربات اور مشاہدات سے علم کس طرح وجود میں آتا ہے؟ یہ درحقیقت انسانی ذہن، اس کی خودی، یا شعور ہے جو مختلف مشاہدات اور تجربات میں وحدت پیدا کرتا ہے، ان کو ایک قانون اسباب وعلل کے رشتے میں منسلک کرتا ہے۔ کیا انسانی تجربہ اور مشاہدہ سے علم ممکن ہوتا، اگر ذہن ان مشاہدات کے لئے پہلے سے ہی قانون اسباب فراہم نہ کرتا۔ ؟ آج اس بات سے کون انکاری ہے کہ یہ قانون قبل تجربی ہیں! اور انسان کا علم ان قبل تجربی قوانین، اور مشاہدات کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

مادیت کا یہ تصور کہ ہم انسانی ذہن وشعور کے علی الرغم اس کائنات کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں ایک ایسا تصور ہے جو ابتداء ہی میں خود اپنی تردید کر دیتا ہے۔

مادیت کے دعویٰ کا دوسرا جزء، یعنی میکانکی قوانین کی عالمگیریت، بھی محل نظر ہے۔ ماہرین سائنس کا یہ تصور کہ حیاتی توانائی بھی طبعیاتی، یا کیمیائی توانائی کی ہی تحویل شدہ شکل ہے۔ ابھی تک محتاج ثبوت ہے۔ مایہ حیوی گو کہ ایک سادہ کیمیاوی مرکب ہے، لیکن ماہرین سائنس ابھی تک کسی ترکیب سے مختلف عناصر جمع کر کے ان کو ذی حیات نہیں بنا سکے وہ شے جو ان کو کیمیاوی مرکب نظر آتی ہے وہ بے جان ہے لیکن جو شے مایہ حیوان ہے، وہ محض ان عناصر کی ایک خاص ترکیب ہی نہیں بلکہ ذی حیات ہے۔ غیر نامیاتی اشیاء اپنے اندر افزائش نسل کی استعداد نہیں رکھتیں۔ یہ ذی حیات اشیاء کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ اگر کوئی شے کسی ایک وقت میں صرف میکانکی اور کیمیائی خصوصیات کی حامل ہو، اور کبھی دوسرے وقت اس میں ایک نئی ترکیب اور کچھ دوسری خصوصیات مثلاً نشو ونما یا افزائش نسل، موجود ہوں تو ظاہر ہے کہ ان نئی خصوصیات کے کچھ نئے عوامل ہوں گے جو پہلے موجود نہیں تھے۔

اگر مادہ کے سینہ میں امکان حیات کو پوشیدہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی حیات اور غیر حیات دو ایسے مظاہر ہیں جن پر ایک ہی قانون کا اطلاق محال ہے۔ حیات ایک ایسا مظہر ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے ہم کو میکانکی قانون سے زیادہ ایک اعلیٰ قسم کے قانون کی ضرورت ہے۔ حیات کی سادہ اور ابتدائی صورتوں سے لے کر اس کی ایک اعلیٰ ترین شکل تک کسی جگہ بھی سبب بحیثیت میکانکی قوت کے قابل عمل نہیں۔ یہاں پر ہم کو ایک دوسری قسم کے قانون اسباب

کی ضرورت ہے۔ جس کو ہم سبب حیاتی یا سبب نفسی کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس لئے کہ عضویوں یا ذی حیات اشیا میں خارجی اور میکانکی اسباب کی بجائے ایک اندرونی حرکت پائی جاتی ہے یہ خود حرکی ہیں۔ اور اس حرکت کے نتیجہ میں ان کی اندرونی ذہانت اور شعور ابتدائی منازل سے خود شناسی کی منزل تک ترقی کرتا رہے گا۔

عضوی زندگی، غیر نامیاتی سے کئی خصوصیات میں مختلف ہے۔ اولاً اس زندگی میں ایک تصور وحدت و تنظیم پایا جاتا ہے، جو مادی اور میکانکی زندگی میں ناپید ہے۔ یوں کہنے کو تو ایک پتھر بھی مختلف ہم مثل اجزا کی ایک وحدت ہے اور پتھروں کو ایک ڈھیر بہت سے پتھروں کی ایک وحدت ہے۔ لیکن یہ وحدت ایک ذی حیات کی وحدت اور تنظیم سے قطعی مختلف ہے۔ ایک پتھر کے ڈھیر کو آپ مختلف پتھروں میں تقسیم کر سکتے ہیں، اور ان میں ہر پتھر اپنی علیحدہ وحدت کا حامل بن جاتا ہے۔ ایک پتھر کے مختلف ٹکڑے اپنی اپنی جگہ کامل وحدت ہیں ان سب کو اتفاقاً ملا دیں تو یہ ڈھیر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف انسانی زندگی یا حیوانی زندگی کو لیجئے۔ ایک انسان میں اجزاء کچھ اس انداز سے وحدت کی ترتیب کرتے ہیں، کہ ان میں سے اگر اجزاء کو علیحدہ کر دیا جائے تو وہ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں اور ان کی کوئی انفرادی وحدت باقی نہیں رہتی۔ کٹا ہوا سر، اس سر سے بالکل مختلف ہے جو انسان کے جسم سے پیوست ہے۔ ہاتھ کی انگلی ہاتھ میں ہی انگلی کہلانے کی مستحق ہے۔ بدن کے تمام اجزاء مل کر بدن بنتے ہیں اور جب یہ بکھر جائے تو اس کا کوئی جز بدن نہیں رہتا۔ یہ وحدت، عضوی وحدت کہلائی جا سکتی ہے اور اس میں جز اور کل کا تعلق کسی میکانکی قوت پر نہیں بلکہ ایک داخلی حرکت اور قوت پر مبنی ہوتا ہے یہی عضوی زندگی کی ثانوی خصوصیت ہے۔ ذی حیات اشیاء کا نظم ایک داخلی وحدت ہے جو خود کفیل ہے اور جس کو کسی میکانکی سبب کی حاجت نہیں۔ اور میکانکی کلیت کی طرح اتفاقاً وجود میں نہیں آیا۔ یہ ایک بامقصد کلیت ہے۔ اس کا ہر جز ایک خاص کام پورا کرتا ہے اور وہ کام اس جز کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے عضوی کلیت بحیثیت کلیت کے، اور اس کے اجزاء بحیثیت اجزاء کے، اپنی اپنی جگہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ جب ہم اس عضوی کلیت کے اعلیٰ مدارج کی طرف صعود کرتے ہیں تو ہم کو ایک

تیسری اور نئی قسم کی وحدت اور تنظیم نظر آتی ہے۔ جو اس کلیت کی تیسری اور سب سے اعلیٰ خصوصیت ہے۔ یہ انسانی شعور میں اس وقت ملتی ہے۔ جب وہ خود شناسی کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ خود شناسی ایک نئی اور اعلیٰ قسم کی وحدت ہے۔ جہاں انسان خود ہی عالم ہوتا ہے۔ خود ہی معلوم اور خود ہی علم انسانی خود آگہی میں یہ سب تفریقیں مٹ جاتی ہیں اور وہ ایک ایسی وحدت سے روشناس ہوتا ہے جس میں جزو اور کل اس طرح سمو جاتے ہیں، کہ کل بلا جزو کے اور جزو بلا کل کے ناقابل فہم بن جاتا ہے۔

زندگی کے یہ مظاہر، اور خاص طور پر خود آگہی کا یہ اعلیٰ ترین مظہر، مادی مظاہر سے اس درجہ مختلف اور ممیز ہیں کہ اسباب و علل کا میکانکی قانون ان کی تشریح کے لئے ناکافی ہے۔ بدیہتاً بھی یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ ایک اعلیٰ مظہر پر ایک ایسے قانون کا اطلاق کیا جائے جو ایک اسفل مظہر کے لئے بنایا گیا ہو۔ ہم اعلیٰ کے لئے ایک نیا قانون تو وضع کر سکتے ہیں، اور اگر ممکن ہو تو اعلیٰ قانون سے اسفل مظاہر کی تشریح بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف ممکن نہیں ہے۔ مادیت اس طرح زندگی کے ان اعلیٰ مظاہر کی تشریح سے قاصر رہ جاتی ہے، اور نتیجتاً ہم کو شعور اور ادراک کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

مادیت کے اس فلسفہ پر اگر ہم ایک دوسرے نقطۂ نظر سے تھوڑا سا غور کریں تو ہم کو کائنات کا ایک بالکل ہی دوسرا تصور حاصل ہوتا ہے، اس نقطۂ نظر کی مدد سے خود اسی فلسفۂ کے مزعومات پر ہم کائنات کی نفسی یا روحانی تعبیر کر سکتے ہیں۔

طبعیاتی علوم ہم کو تبلاتے ہیں کہ حرارت، روشنی، بجلی، مقناطیس وغیرہ کے بظاہر مختلف النوع مظاہر ایک ہی مشترک توانائی کی مختلف صورتیں ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک دوسرے میں تحویل ہو سکتی ہیں اسی طرح کیمیاوی مظاہر بھی اپنی حقیقت میں مندرجہ بالا مظاہر سے مختلف نہیں ہیں خود حیات جس مایہ حیوی پر مشتمل ہے وہ بھی چند کیمیائی عناصر کا مجموعہ ہے۔ پھر سائنس ہم کو یہ بھی تبلاتی ہے کہ انسان سے لے کر ادنیٰ حیوانات اور پھر ایک وحد خلیہ والے عضو تک ایک درجہ بدرجہ ارتقاء ہے۔ زندگی اس واحد خلیہ میں بھی اسی طرح پائی جاتی ہے۔ جس طرح انسان میں۔ یہ عظیم فرق جو اس عضویہ اور انسان میں نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس

عظیم سلسلے کی دو انتہائی کڑیوں کو دیکھ رہے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ورنہ یہ ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں جن میں فرق نہایت ہی تدریج کے ساتھ عمل میں آ رہا ہے۔

حیوانات کی زندگی سے آگے بڑھ کر اگر ہم نباتات کے زمرہ کو لیں تو ہم کو معلوم ہو گا کہ نیچے درجے کے عضویوں اور بعض نباتات کی قسموں میں تمیز کرنا بے انتہا مشکل ہے۔ یہ دونوں اپنی تشکیل اور عمل میں ایک دوسرے سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ اگر کچھ خصوصیات کی وجہ سے ہم حیوانات میں زندگی کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں تو کیا نباتات میں ان ہی دلائل کی رو سے حیات کا تسلیم کرنا لازم نہیں آتا۔ اگر آپ ایک قدم اور آگے بڑھیں تو ابتدائی نباتات میں بھی آپ کو چند شکلیں ایسی ملیں گی۔ جن کو جمادات سے بمشکل تمیز کیا جا سکتا ہے۔ کیا سلسلہ حیات جمادات تک وسیع ہے؟ کیا جمادات میں بھی زندگی ہے؟ چاہے وہ اس ترقی یافتہ شکل میں موجود نہ ہو جس میں ہم اس کو انسان میں دیکھتے ہیں! اس کا جواب اثبات میں دینا اس لئے زیادہ آسان ہے کہ اس طرح اس کائنات میں زندگی کی ابتدا کا مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ مادیت اس سوال کے جواب سے قاصر ہے کہ مادہ سے زندگی کس طرح وجود میں آئی۔ ایک بے جان شے، آخر کس طرح ایک ایسی صفت کو میکانکی قوانین کے زیر عمل جنم دے سکتی ہے۔ جو اس کے اندر پہلے سے موجود نہیں تھی۔ اگر مادیت اپنی تحقیقات کے بل بوتے پر ہمہ مادیت کے فلسفہ کا ادعا کر سکتی ہے تو ان ہی بنیادوں پر زیادہ آسانی کے ساتھ اور زیادہ عقلی طریقہ پر ہمہ نفسیت یا ہمہ روحیت کا فلسفہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کائنات کے اعلیٰ مظاہر کے قوانین ادنیٰ مظاہر کی توجیہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس ممکن نہیں ہے۔

نفسیات اور مذہب

موجودہ دور میں مذہب سے روگردانی کا سبب ماہرین نفسیات کے چند نظریئے بھی ہیں۔ ان میں سے کرداریت + تو مادیت ہی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اس کی فلسفیانہ بنیادیں ہی کمزور ہیں اور یہ نظریہ انسانی اعمال اور افعال کی توضیح کے لئے کافی نہیں ہے۔ کرداریت

خود ہی اپنی اس خامی کی اقراری ہے اور اپنے دعووں میں تخفیف کر رہی ہے۔ کرداریت کے علاوہ جن ماہرین نفسیات نے مذہب کے بارے میں کلام کیا ہے ان میں ولیم جیمس، لیوبا اور فرائڈ زعماء کا درجہ رکھتے ہیں۔ فرائڈ کے زیر اثر نفسیاتی تجزیہ کے جو دوسرے مذاہب فکر پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نفسیات ایک نوخیز علم ہے اور پچھلے سو سال میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ نفسیات نے مذہب کو از کار رفتہ ثابت کر دیا ہے یا اس کی ایسی توجیہات پیش کر دی ہیں جن کی وجہ سے مذہب کی اہمیت اور اس کا تقدس ختم ہو گیا ہے۔ ولیم جیمس کو ان تینوں میں زمانی تقدم حاصل ہے۔ ۰۲-۱۹ء میں "مذہبی وجدان کی اقسام" کے عنوان سے اس نے اڈنبرا میں لیکچر دیئے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اس کتاب میں مذہب کی نفسیاتی توضیح کے لئے ایک نئے طریقے کی ابتدا کی گئی ہے۔ جیمس کا منشا یہ ہرگز نہ تھا کہ مذہب کی ایک آسان سی نفسیاتی توجیہ پیش کر دی جائے بلکہ درحقیقت یہ کتاب ان ماہرین نفسیات کے خلاف احتجاجاً لکھی گئی تھی، جو یہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک ایسا غیر اہم مسئلہ جس کی نہایت سہل نفسیاتی توجیہات ممکن ہیں۔ جیمس نے مذہب کے نکتہ چینوں کو یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ مذہبی نظام میں اس سے کہیں زیادہ مواد موجود ہے جتنا انہوں نے سمجھ رکھا ہے۔

جیمس کا منشاء مذہب کی قدر و قیمت متعین کرنا نہ تھا بلکہ مذہبی وجدان اور مظاہر کو بیان کرنا تھا۔ اس قسم کے برتاؤ کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ مذہب کے اہم حصہ یعنی اس کی قدر و قیمت اور اس کے معروضات کی حقیقت پر سے لوگوں کی توجہ ہٹ کر محض مذہبی وجدان کے بیان پر مرکوز ہو گئی۔

ولیم جیمس کی کتاب کا عام رجحان تو مذہب کی اہمیت کو کم کرنا اور اس کی حقیقت کو گھٹا کر پیش کرنا نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کے لئے ایک بنیاد فراہم کرنا ہے۔ لیکن اس کا بیان دفاعی ہے مذہبی وجدان کے بیان سے جیمس نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ مذہبی رہنماؤں کے اکثر وجدان ایک نفسیاتی مرض کا مظہر ہیں جو ذہنی عدم توازن کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس قسم کے وجدانات سے ہمارے لئے ایک مثالی زندگی کا تصور اخذ کیا جا سکے۔

۲۔ مذہبی وجدانات ناقابل انتقال ہیں اور صرف اس شخص کے لئے قابل قبول ہیں اور حکم کا درجہ رکھتے ہیں جو ان کا حامل ہو دوسروں کے لئے ان کی پیروی ضروری نہیں ہے ان وجدانات کے ذریعہ انسان حقیقت کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ ایسی حقیقت جس سے عام آدمی بے خبر ہے۔

(۳) مذہبی حقائق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سائنسی طریقہ پر صحیح ثابت ہوں اور ان کا مظاہرہ کسی سائنسی مسئلہ کی طرح کیا جا سکے، مذہبی حقائق کی سچائی اس طریقہ پر منحصر نہیں ہے۔

ولیم جمیس کی یہ کوشش مذہب کی موافقت میں تھوڑی دور تک تو ہمارے ساتھ رہتی ہے لیکن مذہب کی ضرورت کو کلی طور پر نہیں سمجھا سکتی۔ اس کے نتائج زیادہ تر خود اس کے اپنے فلسفہ پر مبنی ہیں۔ اس نے اس تصور کے ابطال کی کوشش کی کہ چونکہ مذہبی عقائد عقلی معیار پر پورے نہیں اُترتے اس لئے ان کو رد کر دینا چاہیئے۔ جمیس کے نقطۂ نظر کے مطابق عقائد عمل کے رہنما ہیں اور ہمیں ان کو رد کرنے کی بجائے ایسے عقائد کا انتخاب کرنا چاہیئے جو ہمارے عمل کی بہترین رہنمائی کر سکیں، چاہے وہ عقلی طور پر صحیح ثابت نہ ہو سکیں۔

ولیم جمیس کے بیان کی سب سے بڑی کمزوری جو مذہب کے حق میں بالآخر مضر ثابت ہو سکتی ہے یہ ہے کہ مذہبی وجدانات کی صحت اور عدم صحت کا اس کے پاس کوئی معیار نہیں ہے ان وجدانات کو وہ ایک ایسے مظہر کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے، جو عام ہے اور مختلف قوموں، مختلف نسلوں اور مختلف زمانوں میں پایا جاتا رہا اور ان میں کئی باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن مذہب کی حقیقت وہ قدر مشترک نہیں جو استقرائی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے صحیح اور سچا مذہب وہ جوہر نہیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہو۔ مذہب کی حقیقت تو صحیح معنوں میں اس اختلاف سے معلوم ہوتی ہے جو ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے مابین پایا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مذہب ایک مبہم ساجذبہ یا عاطفہ بن کر رہ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اسلام اور مسیحیت ایک ہی حیثیت کے دو مذاہب سمجھے جائیں گے اور ان کی تفریق ختم ہو جائے گی۔ جس طرح انسانیت کو ہم بربریت اور تہذیب کی قدر مشترک نہیں ٹھہرا سکتے بلکہ اس کی حقیقت کو ہم ان دونوں کے اختلاف سے ہی معلوم

کر سکتے ہیں اسی طرح مذہب کی حقیقت کا پتہ بھی ان مشترک عوامل سے نہیں ہو سکتا جو دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہیں بلکہ ان کے اختلافات سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے محض تجرباتی طور پر حاصل شدہ مذہب کے تاریخی تصور سے آگے بڑھ کر ہم کو ایک ایسے تصور تک پہنچنا ہوگا جو خود کو گم کئے بغیر، مختلف مذاہب میں مختلف زمانوں میں ظہور کرتا رہا ہے، ایک ایسا اعلیٰ تصور جس کے برآوری کے لئے ساری انسانیت روز ازل سے جد و جہد کرتی رہی ہے۔

ولیم جیمس کے نظریہ کے مطابق مذہبی وجدانات نہ تو منتقل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی وہ دوسروں کے لئے کوئی قطعیت رکھتے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان کے حاملین میں اور اختلال دماغی رکھنے والوں میں کوئی امتیاز کرنا بھی مشکل ہے۔ ایسی صورت میں مذہب کی حیثیت محض ایک وقتی ضرورت کی رہ جاتی ہے۔ اس کے قبول کرنے کا صرف ایک ہی اصول وضع ہو سکتا ہے۔ اگر انسان مذہبی عقائد کو اپنے عمل کی رہنمائی کے لئے استعمال کر سکتا ہے تو اس کو ان عقائد کو قبول کر لینا چاہئے۔ مختصراً مذہب کی ضرورت اس نقطۂ نظر کے مطابق ایک جملہ شرطیہ ہے جو "اگر" سے شروع ہوتا ہے اور جس کی صحت اور صداقت کا معیار اس کا قابل عمل ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر اس تصور کا جو قابل عمل ہو لازماً صحیح ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حق اور صداقت ہمیشہ قابل عمل ہوتے ہیں لیکن اس دنیا میں باطل بھی قابل عمل ہے۔ حق اور صداقت کا معیار اس کا مفید ہونا۔ یا قابل عمل ہونا نہیں، بلکہ کچھ اور ہے۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ مذہب اور اس کا فائدہ ایمان پر منحصر ہے لیکن ایمان خود اس عقیدہ پر منحصر ہے جس پر آپ ایمان لاتے ہیں۔ اگر کسی عقیدہ یا تصور کے متعلق خود انسان اس شک میں رہے کہ یہ اختلال دماغی کی پیداوار ہے، تو کیا اس پر ایمان لانا ممکن ہوگا؟

ولیم جیمس کا یہ کہنا کہ مذہبی رہنماؤں کے وجدان نفسیاتی روگ کا مظہر ہیں۔ حقائق کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور خود اس کے اپنے فلسفہ کی روشنی میں بھی اس قسم کا دعویٰ کرنا نا ممکن ہے۔ مذہبی رہنما، خصوصاً انبیاء کرام کی زندگیوں کا حال تاریخ و سیرت ... کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے جن کو پڑھ کر ایک معمولی فہم رکھنے والا بھی یہ بتلا سکتا ہے کہ ان نفوس قدسیہ پر اس قسم کی باتیں اتہامات

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ یہ تو ماہرین نفسیات کی اپج ہے کہ وہ زندگی کے ہر مظہر کی نفسیاتی توجیہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی زندگی کی بہت سی ایسی پر پیچ گتھیاں باقی ہیں جن کو ان کا ناخن تدبیر سلجھا نہ سکا ہے۔

ولیم جمیس اپنے زعم غیر جانبداری میں مذہبی رہنماؤں، اور غیر مذہبی مختل انحاس میں تمیز قائم نہ کرسکا۔ وہ آنحالیکہ ان وجدانات کو اگر سائنسی طریقہ پہ ترتیب دیا جائے تو دونوں اقسام کا فرق واضح ہوسکتا ہے۔

ولیم جمیس کا یہ بیان بھی کہ مذہبی وجدانات وتجربات ناقابل انتقال ہیں اس لئے صرف اس شخص کے لئے قابل قبول ہیں جو ان کا حامل ہو، درست نہیں ہے۔ ناقابل انتقال ہونا صرف مذہبی وجدان ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر تجربہ اور وجدان میں یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جمیس کے اس اصول کو اگر صحیح مان لیا جائے تو دنیا کا کوئی کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ کسی شخص کی اطلاع قبول نہیں کی جاسکتی اور کوئی بیان تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ بیانات صرف اس شخص کے ذاتی "تجربہ" پر مبنی ہوتے ہیں جو ناقابل انتقال ہے۔

اصل میں جس ماہر نفسیات نے مذہب کی حقیقت کو محض نفسیاتی بتلانے کی کوشش کی ہے وہ لیوبا ہے۔ لیوبا نے اپنی تحریروں میں اس دعویٰ کو پیش کیا ہے کہ مذہب ایک نفسیاتی عمل ہے اس لئے وجود خدا اور آخرت وغیرہ جیسے مذہبی عقائد کو حقیقی تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مذہبی مظاہر کو ہم، لیوبا کے نقطۂ نظر کے مطابق، نفسیاتی قوانین کی روشنی میں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ نفسیاتی قوانین اسباب وعلل کے اُن قوانین سے مختلف نہیں ہیں جنکی مدد سے ہم اس دنیا میں مادی اجسام کی حرکت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیوبا کا یہ دعویٰ کہ نفسیاتی قوانین کی مدد سے ہم مذہبی وجدانات کو اسی طرح متعین کرسکتے ہیں اور ان کے متعلق اسی انداز سے پیشین گوئی کرسکتے ہیں۔ جس طرح سائنس داں آج ایک راکٹ کے دائرے کو متعین کرتے ہیں اور اس کی منزل مقصود کی پیشین گوئی کرتے ہیں، بدیہتًا غلط ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ نفسیاتی مظاہر میں ہم عملًا اس قسم کی پیشین گوئی نہیں کرسکتے جو ہم طبعیات علوم میں کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ زید کو یونیورسٹی کا ایک وظیفہ مل جائے گا اس لئے کہ اس کا معاوضہ ماننت ہے ۱۵۰ ہے یا یہ کہ بکر کو عنقریب کسی بچا کے ذہنی

سے سابقہ پڑے گا اس لئے کہ وہ اپنے باپ کے خلاف ایک دبے ہوئے عناد کا شکار رہے۔ اس قسم کی پیشین گوئیوں میں اگر اکثر درست نکلتی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ نفسیاتی قوانین صحیح ہیں ورنہ غلط۔ لیکن یہ کہنا کہ مذہبی وجدانات یا دنیا کے کسی بھی دوسرے مسئلہ کے بارے میں ہم کو نفسیاتی علم پر اتنا عبور حاصل ہو چکا ہے کہ ہم ان تمام عوامل کو ہے تبلا سکتے ہیں۔ جو اس قسم کے مظاہر میں کار فرما ہیں ایک ایسی جسارت ہے جس کی نفسیات خود متحمل نہیں ہو سکتی۔

مابعد الطبعیاتی امور کے متعلق یہ حکم لگانا کہ ان کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لئے کہ ہم نفسیاتی طریقہ پر ان امور کو سمجھ چکے ہیں ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ اور نہ مستقبل قریب میں اس کی کوئی امید نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن بھی ہو تو زیادہ سے زیادہ مذہبی وجدانات کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نفسیاتی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

دراصل لیوبا کی یہ ساری کوشش مذہبی رہنماؤں کے اس ادعا پر مبنی ہے کہ مذہب صرف مذہبی صرف مذہبی وجدان پر مبنی ہے۔ اور اس کی حمایت صرف اسی ایک طریقہ سے ممکن ہے۔ یہ رواج آجکل عام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنیاد بڑی حد تک وہ وجدانات ہیں جو مختلف مراتب میں مختلف لوگوں میں پائے جاتے رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے اور مذہب کی ضرورت کی صرف ایک دلیل۔ مذہب محض ان وجدانات پر ہی نہیں بلکہ اور دوسری بہت سی شہادتوں پر بھی مبنی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو مختص کر لینا نہ مفید ہے اور نہ جائز ان میں سے ہر شہادت اپنی اپنی جگہ اہم ہے اور انسان کے کسی نہ کسی داعیہ کے جواب میں وجود میں آتی ہے۔ عقلی شہادتیں، مذہبی وجدانات، نظم کائنات، انسان کی ذاتی اور اجتماعی ضرورتیں سب مل کر مذہب کی ضرورت اور اہمیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ لیوبا اور دوسرے ماہرین نفسیات کی نفسیاتی تفہیم درحقیقت مذہب کی اسی یکطرفہ حمایت کے خلاف جو اگرچہ صحیح نہیں ہے لیکن مویدین کی ایک کمزوری کا پتہ دیتی ہے۔

سگمنڈ فرائڈ، مذہب کو صرف ایک نفسیاتی مسئلہ تبلانے کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارا ذہن فرائڈ کی شہرۂ آفاق کتاب "ایک التباس کا مستقبل" + کی طرف سب سے پہلے منتقل ہوتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے اور عام خیال بھی یہی ہے۔ کہ فرائڈ نے اس کتاب میں مذہب کو ایک التباس ثابت کیا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے صرف کتاب کا

نام ہی نہیں بلکہ کتاب کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گی کہ فرائڈ نے سادہ لوحی سے یہ دعوی نہیں کیا کہ مذہب محض اس لئے ایک التباس ہے کہ اس کی نفسیاتی توجیہ ممکن ہے۔ فرائڈ کو یہ تو یقین تھا کہ مذہبی اعتقادات التباس ہیں لہٰذا مذہبی اور مذہبی اصول کاذب، لیکن اس نے اپنے اس یقین کی کوئی نفسیاتی توجیہ پیش نہیں کی۔ اس کو مذہبی اعتقادات کی صحت اور عدم صحت سے بحث نہیں۔ وہ تو اس مفروضہ سے ابتداء کرتا ہے کہ اگر مذہبی اعتقادات التباس ہیں تو پھر لوگ ان میں شدید ایمان کیوں رکھتے ہیں؟

فرائڈ کے خیال کے مطابق مذہبی اعتقادات اکثر لاشعوری اور غیر عقلی قوتوں کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ انسان نے ابتدائے آفرینش سے اپنے آپ کو فطرت کے ایسے مظاہر میں گھرا ہوا پایا جو اس کے خلاف برسرپیکار تھے۔ مذہبی تصورات کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ ایک مشفق باپ کی طرح انسان کو فطرت کے ان مظاہر کے خلاف تحفظ عطا کر سکیں۔ معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جو معاشرتی احکام وجود میں آئے اُن کی حفاظت مذہبی اعتقادات کا دوسرا کام تھا۔ اور اس سلسلہ میں تصور خدا اور دوسرے مذہبی اعتقادات کا دوسرا کام تھا اور اس سلسلہ میں تصور خدا اور دوسرے مذہبی اعتقادات انسانی تسکین کا ذریعہ بنے

معاشرتی اصولوں کو قائم کرنے کے لئے انفرادی قربانیاں مذہبی فعل سمجھی جانے لگیں۔ مذہب کے اس تصور سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذہبی اعتقادات اور حقائق محض اس لئے قابل قبول ہوئے کہ انہوں نے انسان کی ایک وقتی ضرورت کو پورا کیا اس لئے نہیں کہ وہ صداقت اور حق پر مبنی تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے کہ وہ اعتقادات لازماً غیر صحیح تھے۔

فرائڈ نے التباس کا لفظ ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ التباس ہر ایسا اعتقاد ہے۔ جو انسان کی پوشیدہ خواہشات کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہو اس کا نتیجہ لازماً یہ نہیں ہوگا کہ وہ اعتقاد غلط ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کا انکاری ہو تو یہ انکار بھی اسی طرح کا ایک التباس قرار پاتا ہے جس طرح کہ اس کا اقرار۔ اور خدا کا اقرار اور انکار دونوں اس سے قطع نظر کہ وہ پوشیدہ خواہشات پر قائم ہیں آزادانہ طور پر صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں۔ فرائڈ کے پیش کردہ نفسیاتی اصول مذہبی

اعتقادات کو کاذب ثابت نہیں کر سکتے۔ اور فرائڈ نے خود بھی غالباً مذہبی اعتقادات کو اس لئے غلط سمجھا ہو گا کہ ان کو عقلی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ خود اس کے پیش کردہ اصولوں کے مطابق یہ دلیل صحیح نہیں ہے کہ مذہبی اعتقادات خواہش کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آتے ہیں اس لئے وہ لازماً غلط ہوں گے۔ ہم کسی شے کی صحت یا عدم صحت کی خواہش کر سکتے ہیں (شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح) لیکن اس شے کی صحت اور عدم صحت ہم کو اپنی خواہشات کے علم سے معلوم نہیں ہوتی بلکہ ان حقائق کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے جن کی صحت یا عدم صحت کے متعلق ہم حکم لگا رہے ہیں۔ ایک شخص محض اس دنیا کی زندگی کو آخری تصور کرنا چاہتا ہے اور دوسرا آخری زندگی کا طالب ہے، قطع نظر اس امر سے کہ یہ طلب شعوری ہے یا غیر شعوری، حقیقت کا فیصلہ انسان کی طلب سے نہیں بلکہ خود حقائق سے ہو گا۔

فرائڈ کے مذہبی اعتقادات کو نہ جاننے کی وجہ اس کی نفسیات نہیں ہو سکتی۔ اس کے نظریہ کی صحت اور عدم صحت سے بحث کئے بغیر اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگرچہ یہ نظریہ مذہبی اعتقادات کو باطل قرار نہیں دے سکتا۔ لیکن اس نظریہ نے ایک نفسیاتی انداز سے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں نے اپنی ساری توجہ اس بات کو ثابت کرنے پر مرکوز کر دی کہ مذہب لاشعوری خواہشات پر قائم ہے مثلاً تحلیل نفسی کا ایک ماہر یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا پر آپ کا ایمان محض اس وجہ سے ہے کہ آپ زمانہ طفلی میں اپنے باپ کے دست نگر تھے اس دست نگری کے احساس سے آپ ابھی تک آزاد نہیں ہوئے ہیں اور آپ نے یہ احساس اپنے باپ سے خدائی باپ کی طرف منتقل کر دیا ہے۔

ایک دلیل کی حیثیت سے یہ موقف انتہائی کمزور ہے لیکن زمانے کے فیشن بسا اوقات انسانی عقل کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس موقف کی حقیقت بھی محض ایک وقتی التباس پر مبنی ہے۔ یہ نقطۂ نظر مذہب اور اس کے تصورات کے قبول کرنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے۔

مذہب اور ضابطہ اخلاق

آفتاب کی روشن شعاعیں اور اس کا چمکتا ہوا چہرہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور لوگ اس کی گرمی اور نور کے لطف میں محو ہو کر اس کی حقیقت کو دریافت کرنے سے غافل ہو جاتے ہیں اور بہت کم روشن دماغ ہوتے ہیں جو آفتاب کی ماہیت کو تلاش کرنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ یہی کیفیت مذہب کی ہے کہ اس کے چہرے پر جو اخلاق کا گلگونہ نظر آتا ہے اکثر دیکھنے والے اس کے نظارہ میں غرق ہو جاتے ہیں اور چونکہ اخلاق کا اثر اور فائدہ نمایاں اور محسوس ہے۔ اس لئے مذہب کی نہایت ابتدائی اور بدنما شکلوں میں بھی اس وقت کے لوگ اخلاق کے بہت کچھ حامی ہیں۔ لہٰذا اکثر غور کرنے والے دھوکا کھا جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب میں جو کچھ فائدے ہیں وہ یہی حسن اخلاق کی اشاعت ہے۔ پس ان میں سے جو لوگ مذہب کی دوسری تعلیم یعنی خدا پر ایمان لانے سے چڑتے ہیں۔ وہ کوشش کرنے لگتے ہیں کہ کسی طرح اخلاق کی اشاعت مذہب کے بغیر ممکن ثابت کریں اور جو لوگ خدا کے اعتقاد کو ایسا خوفناک دیو نہیں سمجھتے مگر اس کی ضرورت اور سچے عرفان کے لطف سے بھی چنداں آشنا نہیں ہوتے وہ محض اخلاق کو اپنا منتہائے نظر ٹھہرا کر چونکہ اخلاق کا جلوہ کم و بیش ہر مذہب میں دیکھتے ہیں اس لئے یہ دعوے کرنے لگتے ہیں کہ ہر مذہب اپنے واحد مقصد کو پورا کر رہا ہے اور اس لئے سب کی پیروی باعث نجات ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں۔ نہ اخلاق کی اشاعت مذہب کے بغیر ممکن ہے۔ نہ مذہب عین اخلاق ہے اور نہ مذہب کا فائدہ ہی محض حسن معاشرت۔

انسان کی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنے فائدہ سے اسی صورت میں دست بردار ہوتا ہے جب اس سے بہتر کسی اور فائدہ کی توقع ہو یا کسی بڑے نقصان کا اندیشہ ہو۔ طالب علم جو اپنے مطالعہ میں رات کی میٹھی نیند کے فائدے سے دست کش ہے تو محض اس لئے کہ اس فائدے کو چھوڑ کر علم کے بے بہا مفاد سے بہرہ اندوز ہوگا۔ کاشتکار جو گرمیوں کی دھوپ میں ہل چلانے میں مصروف ہے اور

ٹھنڈی ہوا اور سایہ کے فائدے سے معترض ہے تو محض اس لئے کہ ہوا کھانے سے سال بھر تک بھوکا مرنا پڑے گا۔ اگر یہ خیال نہ ہو تو صرف دوسروں کے نقصان کا خیال کبھی فائدہ حاصل کرنے سے روک نہیں سکتا۔ انسان تمام دنیا کی جڑی بوٹی اور چرند کو اپنی غذا بناتا ہے اور تمام جاندار اور بے جان چیزوں کو اپنے صرف میں لاتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام فائدے دوسری مخلوق کو بے شمار نقصان پہنچا کر حاصل ہوتے ہیں مگر چونکہ اپنا کوئی اور بڑا فائدہ ہاتھ سے جاتا یا کوئی بڑا نقصان اپنے اوپر عائد ہوتا نظر نہیں آتا اس لئے اوروں کے نقصان کی ذرا پرواہ نہیں کرتا۔ نہ صرف یہ کہ انسان غیر انسان مخلوق کے نقصان کی پرواہ نہ کرتا ہو بلکہ اپنے بنی نوع کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور جتنی چیزوں کی عام بنی نوع کو ضرورت ہے ان کو مہنگے داموں خرید کر اپنے صرف میں لاتا ہے اور جو لوگ اس قدر قیمت نہیں دے سکتے اور اس کے لئے تکالیف اٹھاتے ہیں ان کی رعایت نہیں کرتا۔ جب یہ صورت دنیا کے ہر ایک کام میں دیکھی جاتی ہے تو اگر ایک لحاظ کے لئے مذہب کو مٹانے کی کوشش بجا مان لی جائے اور خدا کا وجود اور اس کے جزا و سزا کی طاقتوں کو معدوم فرض کر لیا جائے تو جو لوگ دوسروں کا مال چھیننے اور جان و آبرو لینے میں اپنا فائدہ تصور کرتے ہوں اور نیز دنیوی حکومت کے دائرہ اثر سے باہر یا خود برسر حکومت ہونے کے سبب پورے طاقتور ہوں یا مخفی ریشہ دوانیوں سے کامیاب ہو سکتے ہوں۔ وہ اپنی انسانی مگر مریض فطرت کے ہاتھوں کیا کچھ طوفان برپا نہ کریں گے اور دنیا پر کیا بلا نہ لائیں گے اور اس وقت کون سی طاقت ہوگی جو ان لوگوں کو حسن اخلاق پر مجبور کرے گی اور دنیا میں امن و امان قائم رکھے گی۔؟

کہا جاتا ہے کہ آج کل مہذب ممالک میں اکثر لوگ مذہب کو چھوڑ چکے ہیں اور اس کے باوجود وہ حسن و اخلاق کا اعلےٰ نمونہ ہیں اور معاشرت کو ترک مذہب سے کوئی نقصان نہیں پہنچا مگر اول تو دیگر کمزور اقوام کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت کچھ ان کی اخلاقی حسن و خوبی پر روشنی ڈالتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ نیک برتاؤ محض انہی کے ساتھ ہے جو برابر کے طاقتور اور کلہ بہ کلہ جواب دینے والے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ مذہب کا ہزارہا سال کا طولانی اثر چند صدیوں میں بھی زائل نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ چند نسلوں کی مادی تعلیم اس کو بالکل فنا کر دے۔ یہ تعلیم کہ برائی کا

اثر روح کو تاریک کرنے اور اب اور آئندہ ہزارہا جسمانی اور روحانی نقصان پہنچانے والا ہے اور کوئی ایسا قانون یا قانون بنانے والا ہے جو عالم کے ذرہ ذرہ پر حکومت کرتا ہے اور اس کی نظر کبھی اور کسی وقت خطا نہیں کرتی۔ غرض یہ خیال مذہب کی برکت سے اب تک تمام دنیا کی فضا میں پھیلا ہوا ہے اور اسی کی کشش ہے جو اب تک عقلا اور جہلا کے دلوں کو پورے طور پر حسی فائدے کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی اور یہی کشش ہے جو ڈاکٹر مل کے قول کے مطابق رومتہ الکبریٰ میں کئی نسلوں تک خدا سے غافل ہونے پر بھی ملکی خدمت کی شکل میں حکمران رہی۔ پس مذہب کے بغیر اخلاقی ترقی کی نظیر اس وقت تک پیش ہو سکے گی جب یہ مادی تعلیم اور خدا کا انکار بھی مذہب کی عمر کے برابر طول کھینچے اور تمام زن و مرد پر مذہب کی طرح قابض ہو اور پھر اس وقت کے لوگ اخلاق کا نمونہ بن سکیں۔ حقیقت میں اگر خدا نخواستہ کبھی ایسا زمانہ آئے کہ تمام عالم خدا سے منکر ہو تو وہ وقت نہایت منحوس ہوگا اور یہ انسانی مخلوق اگر اس وقت بھی انسان ہی رہے اور فرشتہ نہ بن جائے تو نہ ملکی حکومت و قانون کی پیش جائے گی اور نہ کھوکھلی اخلاقی تعلیم کے بنائے کچھ بنے گا۔ اس [illegible] ت جو لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہوں گے وہ ایسی قیامت برپا کریں گے کہ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ مگر یقین ہے کہ بفضلِ خدا ایسا دن نہیں آئے گا اور جب تک مذہب انسانی فطرت میں داخل ہے ان مٹھی بھر واویلا کرنے والوں کی کوشش مذہب کو نابود کرنے میں کامیاب نہ ہوگی کیونکہ فطرت کو بدلنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

ایسی کوشش کرنے والے اب بھی اگرچہ چاہتے ہیں مگر مذہب سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ رومتہ الکبریٰ والوں نے ملک کو دیوتا مانا تو اب ڈاکٹر مل اخلاق کو بحال رکھنے کے لئے انسانی زندگی کو معبود بنانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بجائے نادیدہ طاقت کے اس زمینی زندگی کو خدا مان کر ہم اعلےٰ اخلاقی خیالات کی اشاعت کر سکتے ہیں" یعنی نہ خدا کے لئے بلکہ اپنی انسانی زندگی کے لئے ہم ناجائز فائدوں سے دست بردار ہو سکتے ہیں تو اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ

"یہ چھوٹا سا حصہ اور یہ تھوڑی سی بے حقیقت عمر اگر دنیا کے پرے تک دراز نہ مانی جائے تو ایسے چھوٹے سے پیمانہ پر اعلےٰ خیالات کی بنیاد رکھنی ناممکن ہے اور ایسی چھوٹی عمر کا یقین کر لینے کے بعد تو وہی یونانی فلاسفر ایپی کیورس کا عقیدہ اشاعت پا سکتا ہے کہ کھاؤ اور پیو کل تو مرنا ہی ہے۔"

اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ :-

"افراد انسانی کی زندگی اگرچہ حقیر ہے مگر نوع انسان کی زندگی خاصی طویل اور بے انتہا ہے اور جب اس میں سے خاص خاص ملکوں کی زندگی خدا بن سکتی ہے، چنانچہ رومہ والوں نے ایسا کر دکھایا تو عام نوع انسان کی زندگی سے یہ اثر کیوں نہ پیدا ہو سکے گا"

چنانچہ ایسا اثر پیدا ہونے کی تدبیر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

یہ اعلےٰ اخلاق اپنے عروج کے لئے کسی معاوضہ کی امید پر منحصر نہ ہوگا بلکہ اس کا ایسا معاوضہ ہوگا جو دیکھا جا سکے گا اور جو تکلیف کے وقت تسلی اور کمزوری کے وقت سہارے کا کام دے اور وہ معاوضہ اگلے جہان کی خشتیہ زندگی نہیں بلکہ اسی زندگی میں لوگوں کی خوشنودی ہے جن کی ہم عزت کرتے ہیں اور خیالی طور پر ان تمام مردہ اور زندہ لوگوں کی پسندیدگی ہے جن کی تعریف و تعظیم کے ہم معترف ہیں کیونکہ یہ خیال کہ ہمارے مردہ آباؤ اجداد ہمارے اطوار کو پسند کرتے ہوں گے ایسا ہی طاقتور ہے جیسا یہ خیال کہ زندہ لوگ پسندیدہ کرتے ہیں اور یہ تصور کہ سقراط، ہاورڈ، واشنگٹن، انٹانی نس یا مسیح ہمارے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوں گے یہ کہ ہم بھی اسی نیت سے کام کرتے ہیں جس نیت سے وہ کرتے تھے بہت سے نیک دلوں کے لئے اعلےٰ اخیالات کے واسطے قوی محرک ہوا ہے"

ڈاکٹر موصوف اس تدبیر سے نیک اخلاق پیدا کرنے کے لئے خدا کو چھوڑ کر کوئی محسوس محرک پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جہاں آ کر ٹھہرے ہیں دیکھا جائے تو تکیہ اسی غیر محسوس طاقت پر ہے، یعنی خدا نہ سہی اپنے آباؤ اجداد اور بزرگوں کی ارواح کو حاضر مان کر ان کی خوشنودی کا فائدہ مدنظر رکھنا پڑا۔ اگر ان کی زور دار تقریر کے ساتھ، جس میں بزرگوں کو شفیع بتایا گیا ہے وہ فلسفیانہ خیال بھی لکھ دیا جاتا کہ روح کوئی چیز نہیں اور مرنے کے بعد جسمانی اجزا اپنے اپنے عناصر میں مل جاتے ہیں اور غبار بن کر اڑ جاتے ہیں تو پھر دیکھتے کہ مردہ اور زندہ لوگوں کی خوشنودی کیونکر ہم سے ہمارے مفاد کو پورا ہو سکتی کیونکہ جب وہ مر کر کچھ رہے ہی نہیں تو اب خوشنودی مٹی اور ہوا کی ہم کو کیا تسکین دے گی؟ الغرض نا ممکن ہے کہ کوئی طاقت خوشنود ہونے والی اور جزا و سزا دینے والی ماننے کے بغیر انسان نیک اطوار پر مجبور ہو سکے ... پس فطرت انسانی میں داخل

ہونے کے سبب اگر مذہب کی اصلاح و ترقی انسانی فرض ہے تو مدار اخلاقی ہونے کے باعث اس کی تلقین و اشاعت اخلاقی فرض ہے۔

ان لوگوں نے مذہب کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا اور اس لئے مذہب کو چھوڑ کر اخلاق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی ماہیت سے ناآشنا نہیں ہیں اور جانتے ہیں کہ مذہب خدا پر ایمان لانے کا نام ہے۔ لیکن جو لوگ تمام مذاہب کو باعث نجات اس لئے مانتے ہیں کہ سب میں اخلاقی تعلیم موجود ہے وہ لوگ مذہب کی ضرورت کو تسلیم کرنے باوجود مذہب کی حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اس کی اصلی خواہش خدا کا اعتقاد اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہے اس لئے کہ شروع سے لے کر آج تک مذہب کی تمام شکلوں میں اور مذہبی ترقی کے تمام مدارج میں ایک بالاتر ہستی کا یقین کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کو اعلیٰ مقصد اور منتہائے نظر مانا جاتا ہے جب مذہب کا یہ مطلب ہے تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ اور چیز ہے اور رحم و انصاف، شرافت و شجاعت وغیرہ جداگانہ اوصاف ہیں۔ پس جس طرح شجاعت اور دلیری کی مشق کرنے سے صنعت و حرفت یا نجوم کی مہارت سے نجاری کا علم حاصل نہیں ہو سکتا سچائی اور ہمدردی کا وصف پیدا کرنے سے علم و حکمت کا وقوف پیدا نہیں ہوتا اسی طرح انسان نیک برتاؤ اور حسن معاشرت میں لاکھ امتیاز پیدا کرے معرفت و شہود سے بہرہ یاب نہ ہو سکیگا۔ پس جو لوگ محض اخلاق سے خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ زمین پر چلنے سے آسمان پر چڑھنے کی امید رکھتے ہیں۔ غرض اگر دنیا میں علت و معلول کا قانون ناقابل تنسیخ ہے اور اگر ہر ایک مدعا کے لئے اس کے مناسب حال اسباب ضرور ہوا کرتے ہیں تو یا تو خدا کا عرفان حاصل کرنے کے لئے مذہب کی اس حد تک پہنچنا ضرور ہوگا جس میں خدا کی سچی معرفت کی تلقین ہو اور خدا کو انہی اوصاف و خواص سے ماننا ہوگا جو واقعیت رکھتے ہوں اور اگر نہیں یعنی اگر خدا کی حقیقی معرفت پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو تو پھر یہ کہنا چاہئے کہ مذہب کی اصل کشش انسان کے اندر ایک غیر ضروری عنصر ہے اور اس طرح نتیجہ وہی ہوگا جو مذہب سے انکار کرنے والے مانتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوگا کہ وہ لوگ مذہب کے علانیہ دشمن ہیں اور یہ بظاہر اس کی ضرورت کا دعویٰ کرتے ہیں اور درپردہ بیخ کنی چاہتے ہیں اور ان کی جانب سے جو حمایت ہوتی ہے وہ درحقیقت ایک اور جذبہ فطرت یعنی اخلاق کی ہوتی ہے

اس میں شک نہیں کہ خدا کی معرفت پیدا ہونے کے بعد خواہ وہ کسی درجہ کی ہو اس کے ساتھ مناسبت اور تعلق پیدا کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اس کے واسطے ایک طریق وہ غور و فکر کی شکلیں ہیں جن کو عبادت کہا جاتا ہے اور دوسرا طریق یہ ہے کہ جس قسم کے اوصاف اور خواص خدا کے معلوم ہوتے ہیں اسی قسم کے اوصاف اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً خدا رحم، انصاف، سزا کے قوانین سے دنیا کو قائم رکھتا ہے اس لئے انسان بھی اپنی طاقت کے موافق ان اوصاف کو حاصل کرے اور مخلوق خدا کے ساتھ وہی سلوک روا رکھے جو اپنے ذہن میں خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس لئے اخلاق بہت بڑی حد تک مناسبت اور تعلق میں مدد دینے والے ہیں اور نہ صرف دنیوی حیثیت سے بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی نہایت ضروری اور مفید ہیں اور اس لئے مذہب اعتقاد کے بعد اخلاق کی بھی ویسی ہی تاکید کرتا ہے جیسی غور و فکر یعنی عبادت کی۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ اخلاق اور عبادت سے جو مناسبت اور تعلق خدا کی ذات سے پیدا ہو گا وہ قدر و کیفیت میں اسی درجہ پر ہو گا جس درجہ تک خدا کی معرفت حاصل ہو چکی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص خدا کو مجسم اور مکان اور زمان میں محصور سمجھتا ہے اور پھر عبادت اور اخلاق سے اس کے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے تو اس کا تعلق ایک جسم چیز سے ہو گا اور اسی کی معرفت کا نقش دل پر گہرا ہوتا جائے گا اور یہ نہ ہو سکے گا کہ مجسم سمجھ کر عبادت کرتا ہو اور اس عبادت سے ہی اس کا جسم سے پاک ہونا دل میں بیٹھ جائے۔ پس اخلاق کو تعلق اور مناسبت کے لئے ضروری اور مفید تسلیم کرنے کے بعد بھی مذہب کا مدار معرفت ہی پر رہتا ہے اور کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ناقص معرفت کے وقت اخلاق حسنہ حاصل کرنے سے انسان عارف کامل بن سکے گا اور محض حسن معاشرت سے سچے خدا تک پہنچ سکے گا۔

مذہب ایک انسانی ضرورت ہے

انسان طبعاً کلی تسکین اور طمانیت کا طالب ہے۔ کیا یہ کلی تسکین اور طمانیت اس کو اپنی زندگی کے چند داعیات کی تسکین سے حاصل ہو سکتی ہے؟ وقتی داعیات میں ایک عاقل آدمی عام طور پر ایسے داعیات کو ترجیح دیتا ہے جن کی تسکین زیادہ مدت تک جاری رہ سکے۔ اس طرح وہ اپنی پوری زندگی کو ایک ایسے نظام میں مربوط کرتا ہے جہاں اس کو داعیات کی فرداً فرداً تسکین کی بجائے ایک کلی تسکین حاصل ہو۔ یہ کلی تسکین زندگی کے ایک ایسے نقطۂ نظر سے حاصل ہو سکتا ہے جو زندگی کے

مختلف داعیات کو ختم کرنے کی بجائے ان کی مناسب اور متوازن تسکین کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں ایک ایسا نقطۂ نظر ہونا چاہیے جو زندگی کی تمام اقدار پر حاوی ہو۔ اور اس کو تمام شعبوں میں ہدایت دے سکے۔ مذہب کا کام ہی یہ ہے کہ وہ زندگی کے لئے ایک مکمل نظام عطا کرے، ایسا نظام جو زندگی کے تمام اعمال اور افعال پر حاوی ہو۔ یوں بھی انسان کی زندگی ایک کل ہے جو اپنے مختلف شعبوں کے لئے مختلف قوانین اور اصولوں کو نہیں اپنا سکتی۔ اس کو اپنی پوری زندگی کے لئے ایک ہی قسم کے اصول اپنانے ہوں گے۔ اگر انسان ایسا نہ کرے تو خود اپنی انفرادیت اور کلیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ مذہب یہ کام دو طرح سر انجام دے سکتا ہے

اولاً وہ زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر عطا کرتا ہے جس کے قبول کرنے کے بعد کائنات کی تمام اشیا کی تعبیر انسان ایک خاص انداز سے کرنے لگتا ہے۔

ثانیاً وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے تفصیلی ہدایات بھی عطا کرتا ہے۔ جن کی روشنی میں انسان اپنی زندگی کے لئے قوانین اخذ کر سکتا ہے۔

انسان کی مختلف داعیات کی اس کلی تسکین کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ انسانی زندگی اپنے داعیات کی تسکین میں ایک جانور کی زندگی سے مختلف ہے ایک حیوان جبلی طور پر اپنے ہر اس داعیہ کی تسکین کرتا رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً برانگیختہ ہوتے رہتے ہیں۔ بھوک پیاس جنس غرض ہر داعیہ اس کی زندگی میں ایک علیحدہ اکائی ہے۔ اس کے برخلاف انسان اپنے ان داعیات کو ایک کل نظام میں سمو دیتا ہے یعنی اکثر مواقع پر کسی داعیہ کے برانگیختہ ہونے کے باوجود انسان اس کی تسکین سے انکار کر دیتا ہے اس لئے کہ اس کی کل زندگی میں اس داعیہ کی تسکین بحیثیت مجموعی مضر ثابت ہوتی ہے۔ کل زندگی کا یہ تصور انسان کی عقل کی پیداوار ہے جو اس کی انفرادی زندگی سے شروع ہو کر کائناتی زندگی تک محیط ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان محض اپنی ذاتی تسکین ہی نہیں اپنی خاندانی تسکین کو بھی اپنے سامنے رکھتا ہے اس لئے کہ اس کی ذات خود مرکزیت سے بلند ہو کر خاندان کی ذات میں تحویل ہو جاتی ہے اور ہر ایسا عمل جو اس کے خاندان کے لئے مفید ہو اس کی ذات کو تسکین پہنچتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ پھر اپنی قوم، معاشرہ دنیا اور پھر کائنات تک محیط ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ اس کی ذات کی تسکین ایک خدائی تسکین میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر انسان کو ایک ایسی ابدی حقیقت سے ہمکنار کرتا ہے جس کو مذہب

کی زبان میں خدا کہا جاسکتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں مرضیات عبد رضائے الٰہی کی تابع ہو جاتی ہیں۔ انسانی زندگی کا یہ ارتقاء خود اس کے داخلی داعیات سے وجود میں آسکتا ہے۔ مذہب کا کام یہ ہے کہ کلی داعیہ کی تسکین کے لئے راہیں فراہم کر دے اور رضائے الٰہی کا علم عطا کر دے، مذہب انسانی زندگی کے اس تقاضے کو پورا کرتا ہے

صحیح اور غلط مذہب میں تمیز

مذہب حق کی صداقت کا ایک بڑا نشان یہی ہے کہ اس کی تعلیمات کے ماننے کی انسانی فطرت میں گنجائش تلاش کرنی چاہئے، نہ کہ جاننے کی۔ اسی لئے پیغمبروں نے ہمیشہ ایمان (یعنی ماننے) کا مطالبہ لوگوں سے کیا۔ مغالطہ یہ ہوا کہ پیغمبروں نے ہم سے جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ کیا تھا نادانوں نے سمجھا کہ وہ ہم سے براہ راست ان کو جاننے اور محسوس کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ پیغمبر کہتے ہیں کہ ان چیزوں کو مانو لیکن احمقوں نے کہا ہم ان چیزوں کو نہیں جانتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ہم کسی سے پھول سونگھنے کا مطالبہ کریں تو اس کے جواب میں وہ کہے کہ ہم پھول کی خوشبو کو کان سے سن نہیں سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں مذہب کے غیبی حقائق الملائکہ، الجنت النار، القبر والبرزخ وغیرہ وغیرہ کے متعلق جو مباحث چھڑے ہوتے ہیں بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ جاننے اور ماننے کے عدم امتیاز ہی پر اس کی بنیاد زیادہ قائم ہے۔ پیغمبر کہتے ہیں کہ ان امور کو مانو اور انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو جان نہیں رہے ہیں۔

مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب سے اس وقت بحث نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے ذریعہ سے جو معلومات انسانی بستیوں میں تقسیم فرمائے ہیں اور جو چیزیں ہم تک پہنچائی ہیں اس کا ایک ایک جزء، ایک ایک مسئلہ، صداقت کے اس معیار پر کھرا ہو کر اترتا ہے اتر سکتا ہے، اتر چکا ہے۔ علماء اسلام نے اس کے لئے ایک خاص علم بنا لیا ہے جس کا نام "علم الکلام" ہے۔ اس فن میں یہی کیا جاتا ہے کہ اسلام کے اصولی مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ کو لے کر دکھایا جاتا ہے۔ کہ اس کے ماننے کے لئے انسانی عقل، ہمارے

فطری فرائض، اندرونی احساسات اور اصول فطرت کس حد تک ہم آہنگ ہیں۔ ہم اپنے اس درس میں اسلامی حقائق اور اسی حیثیت سے انشاء اللہ بحث کریں گے۔

لیکن کیا مذہبی تحقیقات کا دائرہ اسی حد تک ختم ہو جاتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ علماء ظاہر کی کوششوں کا یہ آخری نقطۂ پرواز ہے۔ وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ

۱۔ مذہب کے اصول وعقائد و نظریات ان سوالوں پر مبنی ہیں جو انسانی فطرت سے بلا اختیار ابلتے رہتے ہیں اور ان کے ابلنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔

(۲) وہ یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات علم کے عام ذرائع یعنی حواس و عقل سے دنیا ناممکن ہے اور ان کے حل کے لئے ہر حال میں ہمیں ایک جدید علمی ذریعہ کی جس کا نام مذہب کی اصلاح میں "وحی" ہے احتیاج ہے۔

(۳) وحی اور نبوت کے علمی ذریعہ سے جو جواب ہم تک پہنچا ہے وہ عقل و فطرت اور دیگر فطری احساسات کے بالکل مطابق ہے۔ ان سوالات کو براہ راست جاننے کا کوئی ذریعہ ہم میں نہیں ہے لیکن ماننے اور قبول کرنے کے لئے فطرتِ انسانی بالکل تیار ہے اور بلاشبہ کسی مذہب کے متعلق اطمینان و تشفی حاصل کرنے کے لئے حکیمانہ روش یہی ہو سکتی ہے۔

لیکن مسلمانوں میں ایک اور گروہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ لوگ صرف ماننے پر قناعت نہیں کرنا چاہتے ان کو نبوت و وحی کی معلومات کا مشاہدہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام حواس و عقل کے سوا ہر انسان میں کچھ اور علمی قوتیں بھی پوشیدہ ہیں جن کی طرف مرزا بیدل نے اپنی مشہور غزل کے مطلع میں بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر و سمن درآ
تو زِ غنچہ کم ندمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ

قرآن نے اسی سر انسانی کی تعبیر "نفخت فیہ من روحی" سے کی ہے۔ بہر حال یہ اندرونی قوتیں انبیاء علیہم السلام کے کامل اتباع اور پیروی کے بعد رفتہ رفتہ بیدار ہوتی ہیں۔ اور جس کی یہ مخفی قوتیں کھل جاتی ہیں۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر پہچانتا ہے جن کو وہ اب تک صرف مان رہا تھا بالفاظ دیگر جس شخص کی یہ باطنی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اس کو

مذہبی حقائق کی معرفت وشناخت شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے اسی علم کا نام "معرفت" یعنی "شناختن" ہے کیوں کہ پیغمبروں نے جن چیزوں کو جانا تھا انہی کو وہ پہچانتا ہے اور شناخت ہو یا پہچان اس کا تعلق ان ہی امور سے ہو سکتا ہے جن کے ساتھ گونہ علم، بالواسطہ یا بلا واسطہ، پہلے متعلق ہو۔ چکا ہو۔ معرفت وشناخت کے اس مقام پر جب عارف پہنچتا ہے تو چلا اٹھتا ہے:

صد کتاب وصد ورق در نار کن

جان خود را جانب دلدار کن

صیقلے کن یک دو روزے سینہ را

دفترے خود ساز آں آئینہ را

آئینۂ دل چوں کنی صافی و پاک — نقشہا بینی برون از آب وخاک (رومی)

خلاصہ یہ ہے کہ:۔

پنبۂ وسواس بیروں کن زگوش — تابگوشت آید آواز سروش

بینی اندر دل علوم انبیاء — بے کتاب وبی معید واوستا (رومی)

قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی اس مخفی قوت کے ظہور کا وعدہ فرمایا ہے اور کوشش کرنے والے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

فاتقوا اللہ لیعلمکم اللہ — خدا کے ڈر سے بچو، اللہ تمہیں سکھانے اور بتانے لگے گا۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ — اور جو ہماری راہ میں جد وجہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنی راہیں دکھاتے ہیں۔

لیکن اس معرفت کے حصول کے لئے اہل دل اور ارباب ایمان کی طرف رجوع کی ضرورت ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اصول اسلام کے عقل ودلیل سے اثبات کے طریقہ کا نام علم الکلام ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے کہ کلام کے کیا معنی ہیں۔ لیکن اگر تاریخی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر صرف لغت کی طرف رجوع کیا جائے تو اس لفظ کی تصحیح بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مذہب حق کو باطل سے ممتاز کرنے کا ایک طریقہ تو "معرفت" اور "شناختن" کا ہے۔

جو "عمل" اور "مجاہدہ" پر موقوف ہے اور یہ ہر شخص کو میسر نہیں۔ دوسرا ادبی معمولی طریقہ ہے کہ فطرت انسانی کے ساتھ اس مذہب کی تعلیمات کی وابستگی دکھائی جائے، یعنی انسان کی فطری اور قدرتی گنجائشوں سے اپیل کی جائے۔ اس میں بھی دو راہیں ہیں۔ بعض لوگ باتوں کے ذریعے سے اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہی لوگوں کے طریقہ کو "کلام" یعنی بات کرنے کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ اور بعضوں نے کلام کی اس راہ کو دراز و دور کی راہ پایا کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں ایک ایک مسئلہ کو لینا پڑتا ہے اور فطرت انسانی پر پیش کر کے اس کی وسعت اور گنجائش بنائی جاتی ہے اور پھر اس میں رد و قدح ہوتی ہے اور یہ سلسلہ دور تک چلتا ہے اور بسا اوقات اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو زبان آور ہوتا ہے وہی بازی لے جاتا ہے۔

پھر قطع نظر دور و دراز ہونے کے یوں بھی یہ راہ خطروں سے بھری ہوئی ہے۔ انہی وجوہ سے محققین اسلام نے اس کلامی راہ کو چھوڑ کر ایک اور مختصر راہ نکالی ہے۔

ان بزرگوں نے اندازہ کیا کہ انسانی فطرت جن اعلیٰ اخلاق اور جس اعلیٰ دانش کے آگے جھکتی ہے، جسے پیغمبروں کی سیرت کہتے ہیں، حتی الوسع اسی کو اپنے اندر پیدا کر لیا جائے۔ جب انسان کسی شخصیت پر اعتماد کر لیتا ہے تو پھر جو کچھ اُسے کہا جاتا ہے بغیر دلیل کے مانتا چلا جاتا ہے ارباب علم و اخلاق کے ایک بڑے گروہ نے دین کی دعوت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاذ کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ سچ کے آگے ممکن ہے کہ انسان نہ جھکے لیکن سچے کے نیچے دب جانے پر وہ مجبور ہے۔

واقعہ تو وہی ہے کہ مذہب اور مذہبی حقائق کے متعلق خود مطمئن ہوتے یا دوسروں کو مطمئن کرنے کی طبعی راہ وہی ہے جس پر ہم "اللہ والوں" کو پاتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ جن لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مذہب کی بناء صرف روایت پرستی یا خوش اعتقادی پر قائم ہے۔ "علم الکلام" سے اس غلطی کا ازالہ قطعی طور پر ہو جاتا ہے۔ اس علم کے مطالعہ کے بعد ہر مسلمان اپنے کو خاندانی روایت کا شکار یا خوش اعتقادی کا اسیر نہیں بلکہ عقل و دانش کی روشن راہ پر پاتا ہے۔ الہوسوں کا یہ غوغا کہ مذہبی ہونا یا دیندار ہونا احمق و بے وقوف ہونے کے ہم معنی ہے "علم کلام" سے اس کی تردید پوری قوت کے ساتھ ہو جاتی ہے

بلکہ اس کے برعکس یہ غیر مشتبہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ بے ایمانی، بد اطواری کی زندگی صرف اپنی لوگوں کی ہو سکتی ہے۔ جنہوں نے اپنی عقل و بصیرت پر ظلم کیا ہے اور فسق و فجور کے ہتھوڑوں سے اپنے فطری احساسات کو کچل ڈالا ہے۔

* صحیح روش یہ ہے کہ دونوں راستوں کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔ عقل کو بھی مطمئن کیا جائے تاکہ ذہنی اطمینان کے ساتھ دین کی پابندی کی جائے اور دل کو بھی نور سے معمور کیا جائے تاکہ مذہب کی اصل لذت اور حلاوت محسوس ہو سکے۔ کسی ایک سمت میں بے اعتدالی مذہبی زندگی کے اصل حسن کو مجروح کر دیتی ہے۔

مذاہب عالم

ایک تقابلی مطالعہ

مذاہب عالم: ایک تقابلی مطالعہ

مذہب کی تعریف

* مذاہب عالم کی کثرت اور ان میں عقاید و اعمال کے تنوع کی وجہ سے مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اس کی مختصر اور سادہ ترین تعریف ای۔ بی ٹیلر نے کی ہے۔ " مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے" اس تعریف کی رو سے ہم دنیا کے بے شمار مذاہب کا جوہر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کئی مذاہب ایسے بھی ہیں (مثلاً ابتدً بدھ اور کنفیوشی مت) جن میں ایمان و عقاید کی چنداں اہمیت نہیں اور جن کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک یا اخلاق زندگی گزارنے کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ غالبًا اسی کے پیش نظر میتھیو آرنلڈ نے مذہب کو جذبات سے متاثر اخلاق یا جذباتی اخلاق کہا ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتے ہیں۔ " مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی کردار میں انقلاب پیدا کر دیں۔ بشرطیکہ انہیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔"

مذہب کا ارتقاء

مذہب کے آغاز کے بارے میں اس وقت دو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ایک ارتقائی تصور اور دوسرا وہ تصور جو خود مذاہب نے پیش کیا ہے۔

مذہب کے ارتقائی تصورات کی رو سے انسان کی ابتدا گمراہی اور لاعلمی سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ انسانوں نے مشرکانہ خدا پرستی اور پھر توحید پرستی اختیار کرلی۔ اس عمل کی تفصیلات میں کافی اختلافات ہیں۔ مثلاً کچھ کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا آباؤ اجداد کی محبت سے ہوئی اور کچھ دوسرے مذہب کی ابتداء مظاہر فطرت مثلاً رعد و برق کے خوف سے کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان نے ابتداء میں اپنی جہالت کی وجہ سے مظاہر فطرت کی پرستش شروع کردی اس لئے کہ ابتداء میں اس کی زندگی و موت کا دار و مدار بہت حد تک ان پر تھا مثلاً زلزلے، طوفان سیلاب، آتش فشانیاں وغیرہ۔ لیکن جیسے جیسے اس کا علم بڑھتا گیا۔ اس نے محسوس کرنا شروع کردیا کہ یہ خدائی قوتیں نہیں رکھتے۔ ابتداء میں لوگوں نے ہر چیز کو دیوتا بنالیا تھا۔ لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ خداؤں کی تعداد کم ہونے لگی یہاں تک کہ صرف ایک خدا رہ گیا۔

اس کے خلاف مذہبی نقطہ نظر یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو ساتھ ہی اس کی تمام جسمانی ضروریات کی طرح اس کی روحانی ضروریات (ہدایات) کا بھی سامان کیا۔ پہلا شخص جسے خدا نے بھیجا ہدایت یافتہ بلکہ پیغمبر تھا۔ اس کے بعد بھی لوگوں میں جب گمراہی پھیلی تو خدا نے پھر پیغمبر بھیجے جنہوں نے دنیا کو راہ ہدایت دکھائی۔ تو اس اعتبار سے توحید قدیم ہے اور شرک جدید۔ اس وقت دنیا میں جتنے بڑے مذاہب ہیں (عیسائیت، یہودیت، اسلام وغیرہ) ان کے بانی خدا کے پیغمبر ہی تھے۔ اور اس بناء پر ابتداً ان کی تعلیمات جزوی فرق کو چھوڑ کر یکساں تھیں۔ بعد میں (اسلام کو چھوڑ کر) ہر مذہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے مذہب میں ترامیم کرلیں۔ آگے چل کر ہم نے عیسائیت اور یہودیت کے جو عقائد بیان کئے ہیں وہ درحقیقت وہ عقائد نہیں ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے پیش کئے تھے۔ بلکہ وہ ہیں جو بعد میں تحریفات و ترمیمات کے بعد بن گئے ہیں*

---

* مذہب کے آغاز کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہی ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

موجودہ تحقیقات کے بعد مغربی ماہرین بھی اب ارتقائی نقطہ نظر کو چھوڑ کر مذہبی نقطۂ نظر کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ پروفیسر شمٹ کے کہنے کے مطابق "علم شعوب وقبائل انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب بالکل بیکار ہو گیا ہے۔ نشو ونما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کیا تھا اب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔"

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی تصور کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا" (صفحہ ۲۶۲)

مذاہب کی تعداد کا تعین بڑا دشوار ہے۔ اس لئے کہ ابھی ہمیں پوری دنیا کے لوگوں کے صحیح حالات کا بھی پتہ نہیں لیکن کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مذاہب کے پیرو موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ مذاہب کے پیروؤں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے اور بعض مذاہب صرف سو دو سو افراد کے قبیلوں تک محدود ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے ہم صرف ہندو مت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام پر اس باب میں گفتگو کریں گے۔

ہندو مت:۔ ہندو مذہب کی تاریخ اور اس کے بنیادی عقائد کی نشاندہی نہ صرف غیر ہندو

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء نے ایک ہی دین کی تبلیغ کی اور وہ دین اسلام ہے، دوسری قوموں نے اصل دین کو بگاڑ دیا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پھر اپنے نبی بھیجے تاکہ اصل ہدایت دوبارہ انسانوں تک پہنچا دیں۔ اور یہ دین اپنی آخری شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہم تک پہنچا ہے اور اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے۔

اہل علم، بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی ایک مشکل مسئلہ رہی ہے۔ اس لئے کہ اس مذہب

کے پیروؤں میں ایک سے لے کر تیس کروڑ تک خداؤں کے ماننے والے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور بسا اوقات متناقض عقائد رکھتے ہیں۔ اس تنوع سے ہندوؤں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور بے شمار نئے نئے گروہوں کے عقائد کے لئے گنجائش پیدا کر کے انہیں ہندوؤں میں شامل کر لیا ہے۔

ہندوؤں کا مذہب بہت ہی قدیم اور ہے اس کی اولین شخصیات اور تاریخ پر گمنامی کے بڑے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں، لیکن ایک عام خیال یہ ہے کہ ہندومت کا آغاز اس وقت سے ہوا جب آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا (تقریباً ۱۷۰۰ ق م) آریاؤں کے حملے سے پہلے یہاں دراوڑی نسل کے لوگ آباد تھے جن کی عظیم الشان تہذیبوں کے نشان اب بھی موہن جوڈارو، ہڑپا اور دیگر بے شمار مقامات پر ملتے ہیں اگرچہ ان کے مذہب کے بارے میں ہماری تعداد میں مارے گئے یا محکوم بنا لئے گئے۔

اسی زمانے میں "ویدوں" کی تصنیف عمل میں آئی۔ ان کا زمانہ تصنیف ۱۰۰۰ ق م کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ ان کتب میں دنیا سے فرار اور دنیاوی لذات سے کنارہ کشی کی تعلیم ملتی ہے۔ اس دور میں کسی ایک طبقے کی سیادت کے آثار نہیں ملتے لیکن رفتہ رفتہ ہندوؤں میں ذات پات کا امتیاز پیدا ہونا شروع ہوا۔ ان کے چار طبقے ہو گئے جن میں سب سے بہتر برہمن، اور سب سے کمتر شودر قرار پائے۔ اس ذات پات کی بنیاد پیدائش ہے۔ یعنی جو شخص برہمن پیدا ہوا وہ خواہ کتنے ہی خراب کام کرے برہمن ہی رہے گا۔ اس لئے کہ "برہما" (خالق کائنات) نے اسے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ دوسری مختلف ذاتوں کو اس نے اپنے دوسرے اعضاء جسم سے پیدا کیا ہے۔ چھتریوں کو اپنے بازوؤں سے ویشوں کو اپنے شکم سے، شودروں کو اپنے قدموں سے۔ اسی اعتبار سے ان ذاتوں کے کام متعین ہوئے۔ برہمنوں کا کام تحصیل علم پوجا پاٹ اور تلقین و وعظ ہے۔ چھتریوں کا جنگ اور حکومت، ویشوں کا کھیتی باڑی اور تجارت اور شودروں کا کام چاکری ہے۔ ان ذاتوں کی بندشیں اس قدر سخت ہیں کہ آپس میں شادی بیاہ بھی ممکن نہیں۔ سب سے بُرا درجہ اچھوتوں کا ہے جن کے چھونے سے بلکہ جن کے محض سائے سے اونچی ذات کے

لوگ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اچھوت اس کنویں سے پانی نہیں بھر سکتے جس سے اونچی ذات کے لوگ پانی بھرتے ہیں، ان کے برتنوں میں کھانا نہیں کھا سکتے حتیٰ کہ اونچی ذات والوں کے مندروں میں جا بھی نہیں سکتے۔ بہت سے ہندو مصلحین نے اس شدت کے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور ذات پات کی یہ تقسیم اب بھی ہندوستان میں برقرار ہے۔

ویدوں کے علاوہ ہندوؤں کی مقدس کتابیں اپنشد ہیں جن کا زمانہ تصنیف ۸۰۰ ق۔م کے بعد کا ہے۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام مظاہر کائنات میں ایک ہی روح کارفرما ہے جسے "برہما" کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تناسخ کے عقیدے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے (اگرچہ یہ عقیدہ آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں موجود تھا) عقیدہ تناسخ کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا بلکہ دوسرا جنم لیتا ہے۔ نئے جنم میں وہ جو شکل اختیار کرے گا وہ اس کے پچھلے اعمال پر منحصر ہے۔ اچھے اعمال کر کے وہ اعلیٰ ذات کے انسانوں میں بھی جنم لے سکتا ہے اور برے اعمال کر کے وہ کسی شودر کے گھر پیدا ہو سکتا ہے۔ چور کی سزا یہ ہوگی کہ اگلے جنم میں وہ چوہا بن کر پیدا ہو اور قاتل شیر کی شکل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا دو کتب کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی کتب میں سب سے اہم مہابھارت اور رامائن ہیں جو قدیم رجز یہ مثنویاں ہیں مہابھارت میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے حالات ہیں اور ساتھ ہی مختلف نصیحتیں ہیں جن میں خاص طور پر دنیا کی بے ثباتی اور ظواہر کی کم حقیقی پر زور دیا گیا ہے۔ رامائن میں رام کا واقعہ ہے جو ہندوؤں کے بڑے اوتار تھے۔ ہندو مذہب میں دنیا اور اس کے عیش و آرام کو ترک کرنا روحانی ترقی کے لئے بڑا ضروری ہے اسی واسطے اکثر ہندو سادھو آبادیاں چھوڑ کر ویرانوں میں نکل جاتے ہیں اور وہاں عبادت و ریاضت کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرتے ہیں۔ ریاضت کے لئے وہ نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں مثلاً ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا، کیلوں کے فرش پر لیٹنا انگاروں پر چلنا وغیرہ۔

لیکن اس کے باوجود ہندومت میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ انسان دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہ بھی کرے اگرچہ ایسی صورت میں وہ بلند تر روحانی مدارج کا مستحق نہ ہوگا۔ ایسے آدمی کی زندگی کے لئے چار دور مقرر کر دیئے گئے ہیں پہلا طلب علم کے لئے، دوسرا گھر

گرہستی کے لئے تیسرا غور و فکر کے لئے اور چوتھا محض پوجا پاٹ کے لئے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا، ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا کوئی شمار نہیں لیکن ان میں سے اہم تین ہیں۔ برہما، وشنو اور شیوا۔ برہما اس کائنات کا خالق ہے لیکن اس کے آگے اس کے اختیارات نہیں۔ وہ محض کائنات کے لئے نقطہ آغاز ہے اور اسی بنا پر ہندوؤں میں اس کی عبادت بہت شاذ ہی ہوتی ہے۔ وشنو سلامتی اور بقا کا دیوتا ہے۔ برہما تو انسانی زندگی سے اس سے زیادہ متعلق نہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کیا لیکن وشنو کا تعلق زیادہ دائمی ہے۔ بعض اوقات یہ انسانی شکل میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ ہندو اپنے بڑے رہنماؤں مثلاً رام اور کرشن کو وشنو ہی کا اتار کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ وشنو ان میں حلول کر گیا تھا۔ وشنو تو سلامتی کا دیوتا تھا۔ اس کے برعکس شیوا کا کام حیات کو ختم کرنا ہے اس طرح عملی زندگی میں رائج کرنے والے شیوا اور وشنو ہی ہیں جن کے کام ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔

اس وقت ہندوؤں کی تعداد (اچھوتوں کو ملا کر) ۲۷ کروڑ سے کچھ زیادہ ہے ان سے بیشتر ہندوستان میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان، برما، سیام، ملایا اور انڈونیشیا میں بھی تھوڑے بہت ہندو ہیں۔

بدھ مت

بدھ مت کا آغاز چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس کے بانی گوتم بدھ جن کا اصل نام ساکھیا منی تھا۔ نیپال کے جنوب میں کپل وستو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ وہ ایک شاہی خاندان کے فرد تھے اور ان کی ابتدائی زندگی شہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں گذری۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش پر ایک نجومی نے پیشین گوئی کی تھی کہ کوئی انہوں نے دنیا کے مصائب کا مشاہدہ کر لیا تو تارک الدنیا ہو جائیں گے ورنہ ان کی قسمت میں دنیا کی بادشاہت ہے۔ بدھ کے والد نے یہ سن کر اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ وہ مصائب و آلام سے آشنا بھی نہ ہو سکیں لیکن اس عیش و

عشرت کی زندگی کے باوجود ان کی طبیعت میں غور و فکر کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ساری احتیاطوں کے باوجود انہیں ایک مرتبہ اپنے ملازم کے ساتھ باہر جانے کا اتفاق ہوا اور یک بارگی چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ان کی زندگی یکسر بدل دی۔ انہیں ایک بوڑھا دکھائی دیا جس کی کمر ضعف پیری سے خم ہو رہی تھی۔ پھر ایک مریض پر نظر پڑی جو حالت مرض اور شدت تکلیف سے بیقرار تھا، پھر ایک لاش راستے میں نظر آئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تارک الدنیا فقیر کو دیکھا جس کا چہرہ سکون و طمانیت سے بھرپور تھا ان واقعات نے ان پر بڑا اثر کیا۔ زندگی کیا ہے؟ اس میں اس درجہ مصائب و آلام کیوں ہیں؟ ان سے نجات کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب کے لئے ان کا ذہن مضطرب تھا۔ محلوں کی عیش و عشرت اور ہماہمی سے بھرپور فضا ان مسائل پر غور و فکر کے لئے کسی طرح موزوں نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ ویرانوں کے سکون میں اس مسئلے پر غور کریں گے۔

تیس سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جو لوگ اس زمانے میں اہل علم سمجھے جاتے تھے ان سے استفادہ کیا، اگرچہ بہت کچھ سیکھا لیکن تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ریاضتیں کرنی شروع کر دیں۔ ہر آسائش ترک کر دی حتیٰ کہ چند دانوں سے زیادہ غذا کا بھی استعمال چھوڑ دیا۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ سات دن تک مسلسل ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھے رہے۔ جس کے بعد انہیں اچانک وہ کیفیت حاصل ہوئی جسے "عرفان" کہتے ہیں۔ جس جگہ انہیں یہ عرفان حاصل ہوا تھا اسے "بدھ گیا" کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی تبلیغ و تلقین میں بسر کر دی۔ ۴۸۰ ق۔م میں ۸۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

گوتم بدھ نے اگرچہ صراحتاً خدا کا انکار کہیں نہیں کیا لیکن ان کی تعلیمات میں کسی مابعد الطبیعی وجود کا زیادہ نشان نہیں ملتا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اپنی زندگی کی بہتری کے لئے انسان کو کسی ماورائی طاقت کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص عبادت و ریاضت کر کے اپنے نفس پہ فتح پا سکتا ہے اور اس طرح وہ "نروان" حاصل کرے گا۔ نروان سے مراد ارتقائے نفس کا وہ درجہ ہے جہاں انسان تناسخ کے چکر سے نکل کر نفسانی خواہشات اور دنیاوی افکار و آلام سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یہ گویا طمانیت سکون اور ٹھہراؤ کی بہشت کا نام ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات میں "ہشت پہلو راہ" کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہشت پہلو سے مراد آٹھ چیزیں

کی صحت ہے۔ صحیح ایمان، صحیح ارادہ، صحیح گفتگو، صحیح کردار، صحیح معاش، صحیح فکر، صحیح انکسار اور صحیح مراقبہ، ان آٹھ چیزوں کے علاوہ بھی بدھ متیوں پر پانچ چیزیں لازم قرار دی گئی ہیں۔ اول یہ کہ کسی ذی حیات شے کو زندگی سے محروم نہ کیا جائے۔ دوم کوئی چیز زبردستی یا دھوکے سے حاصل نہ کی جائے۔ سوم، جھوٹ نہ بولا جائے۔ چہارم۔ منشیات سے پرہیز کیا جائے۔ پنجم، جسم کے گناہوں سے بچا جائے۔ ان کے علاوہ گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات میں راہ اعتدال اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس دور میں یا تو ہندو لوگ تھے جنہوں نے آسائش و آرام کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا یا وہ سادھو تھے جو نعائم ہی گھر سے ہوئے تھے۔ گوتم بدھ نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان کی راہ، راہ اعتدال اختیار کی جائے۔ لیکن اس کے باوجود روحانی تقدس حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان دنیا کو ترک کر کے خانقاہی زندگی بسر کرے۔ اس مذہب کی تعلیمات کو حد سے حد ایک ضابطہ اخلاق کہا جا سکتا ہے جس میں انفرادی مسائل اور روحانی تسکین کا سامان موجود ہے لیکن انسان کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی زندگی کے لئے کوئی ہدایت نہیں ملتی۔

شروع میں بدھ مت میں بت پرستی منع تھی اور ابتدائی تصویروں میں مہاتما بدھ کو کسی نشان کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا تھا مثلاً کھڑاؤں یا خالی تخت سے ان کی موجودگی کا تصور پیدا کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ہندو مت کے اثر سے بدھ مت میں بہت سے عقیدے اور رواج داخل ہو گئے۔ جنہوں نے اس کی شکل بدل دی۔ اس نئی شکل کا نام مہایان قرار پایا۔ مہایان کے معنی ہیں" بڑا بار اٹھانے والا"، یہ نام اس لئے مناسب ہے کہ اس میں بہت سے عقیدوں اور رسوم کا بار اٹھانے کی صلاحیت تھی۔ پرانا طریقہ چونکہ ان نئے عقائد اور رسوم کا حامل نہ تھا وہ ہنایان، یعنی کم بار اٹھانے والا، قرار پایا۔

مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کو پھیلانے کے لئے ہر جگہ مبلغین مقرر کئے، عبادت گاہیں تعمیر کیں، کتبوں میں بدھ مت کی تعلیمات لکھوا کر نصب کرائیں اور غیر ممالک میں سفیر بھیج کر اس ملک سے باہر بدھ مت کی اشاعت کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ مذہب ہندوستان میں پیدا ہوا لیکن اب ہندوستان میں اس کے پیرو بہت کم ہیں۔ اس کے ماننے والے زیادہ تر دوسرے ممالک کے باشندے ہیں۔

گوتم بدھ کی تعلیم ہندوستان میں برہمنیت کے خلاف ایک ردعمل تھی۔ اس میں ذات پات کی

تفریق اور کسی مخصوص طبقے کی سیادت کی نفی کی گئی اور اسی وجہ سے یہ مذہب بڑی تیزی سے پھیلا تھا۔ لیکن یہ زیادہ عرصے تک اپنی پاکی برقرار نہ رکھ سکا اور خود برہمنی تصورات سے آلودہ ہو گیا۔ چنانچہ مہایانی فرقہ میں برہمنیت کا عنصر غالب ہوتا گیا اور گوتم بدھ کی بیشتر اصلاحات خارج کر دی گئیں چنانچہ ان میں بت پرستی کا رواج بہت بڑھ گیا۔ دراصل لفظ بت خود "بدھ" کی ایک شکل ہے اور اصنام پرستی کے داخل ہو جانے سے بعض مقامات پر مہایان اور سندومت کا اختلاف بہت کم ہو گیا۔

بدھ متیوں کی تعداد پر بڑا اختلاف ہے۔ بعض نے ان کی تعداد ۵۰ کروڑ تک بتائی ہے لیکن درحقیقت اس وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور یہ چین، برما، سیام، نیپال، بھوٹان، سیلون وغیرہ میں آباد ہیں۔

یہودیت

یہودیت کی بنیاد دو عقائد پر ہے۔ اول خدا کی وحدانیت اور دوم بنی اسرائیل کا خدا کی منتخب اور اور مخصوص امت ہونا۔

تمام الہامی مذاہب میں خدا کی وحدانیت کا تصور موجود ہے۔ اگرچہ اکثر جگہ بعد کے اضافوں اور ترمیموں کی وجہ سے یہ عقیدہ کمزور ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، ابتداً خدا کی وحدانیت کا تصور موجود تھا لیکن بعد میں تین خداؤں کا چرچا ہو گیا۔ موجودہ شکل میں توحید کی تعلیم اسلام کے علاوہ صرف یہودیت میں ملتی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ ایسے عقائد بھی ہیں جن کی وجہ سے یہودیت بھی توحید خالص سے محروم ہو گئی ہے۔

یہودی اپنی نسل کے اعتبار سے بنی اسرائیل ہیں۔ اسرائیل کے معنی ہیں "خدا کا بندہ" اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا کے منتخب اور چہیتے بندے ہیں اور خدا سے ان کا تعلق خصوصی نوعیت رکھتا ہے۔ غلط سہی مگر بالکل بے بنیاد نہیں۔ خود قرآن نے کئی جگہ بنی اسرائیل کی فضیلت کا ذکر کیا ہے۔

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین

اے بنی اسرائیل ذرا میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دیں تھیں اور اس بات کو کہ) میں نے تمہیں پوری دنیا پر فضیلت بخشی تھی۔

لیکن جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ یہ کہا گیا ہے اس فضیلت کا سبب کوئی نسلی یا توارثی امتیاز نہ تھا

بلکہ یہ تھا کہ خدا نے بنی اسرائیل کو اسلام کی دعوت ساری دنیا تک پہنچانے کے فریضے پر مامور کیا تھا۔ پھر جب بنی اسرائیل نے اس فریضے سے روگردانی کی تو ان کو اس مسند فضیلت سے اتار دیا گیا۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے ہی میں مصر آ گئے تھے۔ یہاں ان کی نسل خوب پھلی پھولی۔ اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کے علاوہ ایک نسل قبطیوں کی تھی۔ آگے چل کر جب بنی اسرائیل اپنے فریضہ دعوت حق سے غافل ہوئے تو قبطیوں نے انہیں اپنا غلام بنا لیا۔ اسی غلامانہ انحطاط کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ آپ کا زمانہ بعثت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ۱۲ صدی قبل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے بغاوت کی اور مصر سے ہجرت کر کے جزیرہ نمائے سینا کی طرف آئے۔ کوہ سینا ہی میں آپ پر توراۃ کے بیشتر احکام نازل ہوئے۔ ایک طویل عرصے تک خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔ یہ حکومت گو قلیل رقبے میں تھی اور اس کی آبادی بھی بہت نہ تھی لیکن ہر حیثیت سے برتر اور بہت دولت مند تھی۔

یہودیوں کی تاریخ مسلسل عروج و زوال کی داستان ہے۔ یہ عروج و زوال مادی بھی تھا اور روحانی بھی۔ جب انہوں نے خدا کی نافرمانی کی انہیں زوال ہوا۔ پھر ان میں پیغمبر مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان کو قعر مذلت سے نکالا۔ ان میں داؤد، سلیمان علیہ السلام جیسے پیغمبر بھی مبعوث ہوئے جو ساتھ ہی ساتھ بادشاہ بھی تھے اور جن کے عہد میں بنی اسرائیل کی سلطنت اپنی شوکت کی معراج پر پہنچ گئی لیکن بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر خدا نے ایسے فاتحین بھیجے جنہوں نے فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اب موجودہ دور میں مغربی طاقتوں نے انہیں فلسطین میں دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہودیوں کے عقائد کا ہم اوپر تھوڑا ذکر کر چکے ہیں۔ ایک یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون نے ان عقائد کو ذرا تفصیلاً اس طرح بیان کیا ہے۔ (۱) وجود خداوندی پر ایمان (۲) اس کی وحدت پر ایمان (۳) اس کے دائم ہونے پر ایمان (۴) اس کے غیر مادی ہونے کا تصور (۵) اس پر ایمان کہ عبادت صرف اس کی کی جائے (۶) پیغمبر پر ایمان (۷) اس پر ایمان کہ حضرت موسیٰ سب سے بڑے پیغمبر تھے (۸) اس پر ایمان کہ توارۃ (زبانی و تحریری دونوں) حضرت موسیٰ کو کوہ سینا پر عطا کی گئی (۹) اس پر

ایمان کردہ ناقابل تغیر ہے (۱۰) اس پر ایمان کہ خدا علیم و خبیر ہے (۱۱) یوم آخرت کی جزا و سزا اور حیات بعد موت پر ایمان (۱۲) مسیح کے آنے پر ایمان (۱۳) مردوں کے جلائے جانے پر ایمان۔

یہودیوں کے یہاں سبت کی تعطیل بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سبت کا دن جمعہ کے دن غروب آفتاب سے شروع ہوکر سنیچر کے دن ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ اس دوران میں راسخ العقیدہ یہودی دنیاوی کاموں کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ عبادت اور مراقبہ میں مشغول رہتے ہیں۔

یہودیوں کی مقدس کتاب توراۃ ہے۔ توراۃ کا اصل اطلاق تو ان پانچ کتابوں پر ہوتا ہے۔ جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھیں لیکن اکثر لفظ توراۃ کو زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں یہودیوں کا طرز معاشرت، اخلاق اور طریقہ عبادت سب شامل ہو جاتے ہیں۔ توراۃ آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس وقت کتب کو ضبط تحریر میں لانے کا جو انتظام ممکن ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ پھر بھی ان احکام کو تختیوں پر کندہ کرایا گیا لیکن وہ بھی فاتحین کے حملوں کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ جس نے بھی یروشلم فتح کیا ان نسخوں کو آگ لگادی۔ اور اگرچہ یہودیوں نے اسے محفوظ رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن نہ کر سکے۔ پھر اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ یہودیوں کا اخلاق بگاڑ مذہبی طبقے میں بھی پھیل گیا اور چونکہ نشر و اشاعت کے ذرائع محدود تھے اور توراۃ صرف ان لوگوں کے پاس تھی لہٰذا انھوں نے اس میں من مانی تبدیلیاں کر ڈالیں۔

اپنی طویل تاریخ اور حکمرانی کے باوجود دنیا میں یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور ہمیشہ تھوڑی ہی رہی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جو ان کی شان و شوکت اور عروج کا زمانہ تھا ان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ عددی اعتبار سے وہ سب سے زیادہ عروج پر جنگ عظیم دوئم سے قبل تھے اور اس وقت ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ تھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں نازیوں نے بڑے وسیع پیمانے پر ان کا قتل عام کیا جس کے نتیجے کے طور پر اب ان کی تعداد ایک کروڑ کے لگ بھگ رہ گئی ہے۔

عیسائیت

موجودہ دنیا کی تیس فیصد آبادی عیسائی مذہب کی پیرو ہے اور اس اعتبار سے وہ بلحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔

یہودیت کی طرح عیسائی مذہب بھی درحقیقت براہیمی مذاہب کی شاخوں میں سے ایک ہے

6 یہودیت سے بھی اس کا تعلق بہت ہی گہرا ہے یہاں تک کہ ابتداً عیسائیت کو یہودی مذہب کی ایک شاخ ہی تصور کیا جاتا تھا۔ اس بناء پر عیسائیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہودیت کی تاریخ اور اس کے پیروؤں کے حالات سے باخبر ہوں۔

جیسا کہ ہم سطور بالا میں دیکھ چکے ہیں یہودیوں کو کچھ عرصے کے لئے فلسطین کی حکومت ملی لیکن ان کی گمراہیوں کی وجہ سے دوبارہ چھن گئی۔ اس طرح وہ روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے زوال کا شکار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے انبیاء نازل ہوئے لیکن حالات بدستور خراب رہے۔ یہودی حسب سابق اپنی پستیوں کا شکار رہے اور نہ صرف یہ بلکہ جن انبیاء نے ان کی اصلاح کرنی چاہی۔ ان کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی شرمناک رہا۔ کچھ کو قتل کیا گیا، کچھ کو قید خانوں میں محبوس کر دیا گیا، کچھ کو سنگسار کر دیا گیا، کچھ کو وطن سے نکالا گیا اور کچھ کو آروں سے چیر ڈالا گیا۔ ★

گویا معاشرے میں برائی اس درجہ پھیل چکی تھی کہ راہ حق کو اختیار کرنا تو بہت دور اس کے لئے کوئی آواز برداشت کرنا بھی اس قوم کے لئے ممکن نہ رہا۔ یاد رہے کہ یہ اس وقت کی حالت ہے جب یہودیوں سے فلسطین کی حکومت چھن چکی تھی اور وہ خود اپنے وطن میں رومیوں کے محکوم تھے لیکن اس ساری ذلت اور محکومی کے باوجود عام یہودی جہالت اور توہمات میں گرفتار تھے۔ ان کے فقیہہ محض موشگافیوں اور علماء چھوٹے چھوٹے مسائل پر جنگ کرنے میں مصروف تھے۔ دین موسوی کی روح غائب ہو چکی تھی۔ صرف ایک بے روح ڈھانچہ موجود تھا۔ جس میں علماء یہود نے اپنے حسب منشاء ترمیم و تنسیخ کر لی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن میں دو آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰ یروشلم کے قریب ایک مقام بیت اللحم میں کنواری مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے۔ تاریخی نقطہ نظر سے آپ کی پیدائش اور وصال کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ ★

لیکن بالعموم خیال یہ ہے کہ آپ ۴ ق-م میں پیدا ہوئے اور ۲۹ء میں اس دنیا سے تشریف لے گئے آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی اسی طرح گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تیس سال کی عمر میں آپ

★ یہ سب واقعات خود بائبل میں مرقوم ہیں۔

★ ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔ از ای۔ رائسٹن پائیک صفحہ ۲۰۹

نے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس مقصد کے لئے آپ نے جگہ جگہ وعظ کئے اور معجزوں کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے معجزوں میں بیماروں کو اچھا کرنا، مردوں کو جلانا اور بے روح اشیاء میں جان ڈالنا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں یہودیوں کی حالت جیسی کہ تھی بیان کی جا چکی ہے۔ آپ نے ان علماء یہود کو خاص طور پر ہدف بنایا۔ جنہوں نے دین موسوی میں اپنی من مانی خواہشات کے مطابق ترمیمات کرلی تھیں اور جن کا کام صرف ظواہر پرستی اور قانونی کھینچ تان رہ گیا تھا۔ آپ کی ان تعلیمات سے اس وقت بہت زیادہ لوگ متاثر نہ ہوئے۔ آپ کے ابتدائی متاثرین میں سے اکثر بظاہر معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ مثلاً ماہی گیر وغیرہ اور مخالفت میں یہود کا بااثر اور ذی علم طبقہ تھا۔ ان لوگوں نے یہ سوچ کر کہ لوگ آپ کی تعلیمات سے متاثر نہ ہو جائیں۔ رومی گورنر کو اکسا کر آپ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کرا دیا اور صلیب کی سزا طے ہوئی۔ رومی گورنر آپ کی گرفتاری سے چنداں خوش نہ تھا اور غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ بے گناہ ہیں۔ چنانچہ اس نے یہودیوں کے سامنے یہ انتخاب رکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور براباڈاکو میں سے ایک کو قومی تہوار کے موقع پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ براباڈاکو وقت کا مشہور قاتل تھا اور اسے بھی گرفتار کر کے مصلوب کرنے کا فیصلہ ہوا تھا لیکن یہودیوں نے اکثریت سے فیصلہ کیا کہ براباکو رہا کر دیا جائے اور حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کر دیا جائے۔ لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا اور وہ مصلوب نہ ہو سکے۔ *

---

* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے بہت تھوڑا مواد موجود ہے لہذا اختلافات بہت ہیں۔ اوپر جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ قرآن سے ماخوذ ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ حواریوں کے عقیدے (
) کی رو سے "وہ مقدس باپ خداوند تعالیٰ کے اکلوتے بیٹے تھے جن کا حمل روح مقدس سے ٹھیرا تھا اور جو کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ پونٹیس پلیٹ (
) رومی گورنر کے دور میں تکلیفیں اٹھائیں، صلیب پر چڑھایا گیا اور انتقال کیا۔ دفن کے تیسرے دن بعد زندہ ہوئے آسمان پر چڑھے اور اب خداوند صاحب قوت باپ کے دائیں طرف بیٹھے ہیں" حضرت مسیح کے بارے میں تاریخی مواد کی کمی کی انتہا یہ ہے کہ بہت سے جدید لکھنے والوں نے ان کے وجود تک سے انکار کر دیا ہے (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ریلجنز صفحہ ۲۱۱)

یہودیوں میں مسیح کا تصور موجود تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک بااختیار شخص پیدا ہوگا۔ جو بنی اسرائیل کی رہنمائی کرے گا اور جس کے ذریعے یہودیوں کو دنیوی تفوق حاصل ہوگا۔ جب حضرت عیسیٰ نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تو یہودیوں نے مذاق اڑایا، حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ "میری حکومت اس دنیا کی نہیں ہے۔" جب یہودیوں نے دیکھا کہ وہ رومیوں سے ٹکر لینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو انہیں یقین ہوگیا کہ یہ مسیح نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ وہ دنیوی تفوق کے خواہاں تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیت نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ یہودیوں اور رومیوں دونوں کے مظالم اس مذہب کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء میں روم جہاں عیسائیوں کا اقتدار بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں ایک دور وہ بھی آگیا تھا کہ پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔

ایک طرف تو سیاسی قوت تھی اور دوسری طرف مذہبی اثر اور بھرپور دولت، ان چیزوں نے چرچ کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا لیکن عیسائی رہنماؤں نے اس قوت، دولت اور اثر کا زیادہ اچھا استعمال نہ کیا۔ وہ حضرت مسیح کی سادہ اور بے تکلف زندگی چھوڑ کر عیش و عشرت میں گھر گئے۔ دولت حاصل کرنے کے لئے برے سے برے ذرائع اختیار کئے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دور وہ آیا کہ پوپ نے "جنت کے سرٹیفکیٹ" فروخت کرنے شروع کر دیئے۔ ان کی قوت کا استعمال صرف یہ رہ گیا کہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگائیں اور ان اختلافات میں اس درجہ بڑھ گئے کہ معمولی سا اختلاف رکھنے والوں کو موت کی سزا دے دی جاتی تھی اس مقصد کے لئے خاص عدالتیں قائم کی گئیں جنہیں احتسابی عدالت کہتے ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک ان عدالتوں نے تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں، ان میں سے صرف ۳۲ ہزار وہ تھے جنہیں دہکتی آگ کی نذر کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں گلیلیو جیسے ماہرین سائنس شامل تھے۔ اٹلی کے مشہور سائنسدان برونو کو بھی اشاعت علم کے جرم میں آگ کی نذر کر دیا گیا۔ فلکیات پر کوپرنیکس کی کتاب مدتوں ممنوع رہی۔

چرچ کے انہی مظالم کی بناء پر بہت سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو ... ہے اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور اسی پس منظر کی بناء پر آج بھی بعض لوگ مذہب اور سائنس کو

متضاد تصور کرتے ہیں۔

عیسائی مذہب کے عقائد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ تثلیث ( ) کا عقیدہ ہے۔ اس خدائی تثلیث میں باپ، بیٹا اور روح القدس شامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس تثلیث کا دوسرا فرد تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کے بیٹے قرار پائے اور الوہیت میں اس کے شریک ہوئے۔ رومن کیتھولک چرچ کے نزدیک اس تثلیث میں مقدس مریم کا بھی اضافہ ہونا چاہیئے۔

"تثلیث کا عقیدہ اگرچہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے ہے لیکن ہمارے پاس اس بات کے بڑے قوی دلائل ہیں کہ ابتداء میں یہ کوئی متفق علیہ عقیدہ نہ تھا۔ عیسائیت کی ابتداء میں ہمیں بے شمار ایسے فرقوں کا نشان ملتا ہے جو عقیدہ تثلیث کے قائل نہ تھے بلکہ حضرت مسیح کو خدائے واحد کا بندہ تسلیم کرتے تھے۔ تیسری صدی عیسوی میں نائیہ کی کونسل میں جب اس عقیدے کو پیش کیا گیا تو وہاں بڑے شدید اختلاف ہوئے، اگرچہ اس عقیدے کو منظور کر لیا گیا لیکن اختلاف کرنے والے اپنے اختلاف پر مصر رہے۔ ایک مشہور عیسائی عالم چارلس اینڈرسن اسکاٹ کے کہنے کے مطابق۔ ابتدائی تین اناجیل میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بناء پر یہ گمان ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے مسیح کو انسان کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہیں، ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا۔ ایک ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوا تھا..... اناجیل کی متعدد عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح اپنے آپ کو صرف نبی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے" بلکہ ایک فرقہ اس وقت بھی موجود ہے جو اپنے آپ کو مواحد کہتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل ہے جو عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید پر مشتمل ہے۔ عہد نامہ جدید میں چار اناجیل شامل ہیں۔ متی، لوقا، مرقس اور یوحنا ان کے علاوہ کچھ خطوط بھی اس میں شامل ہیں ان اناجیل کے علاوہ اور بھی اناجیل موجود ہیں لیکن ان کو غیر مستند قرار دیا جاتا ہے۔ چار اناجیل میں بھی باہمی اختلافات موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے نسب نامہ میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ ان اناجیل کے متعلق عقیدہ ہے کہ وہ ان چار مصنفین کو فرداً فرداً علیحدہ القاء ہوئی تھی۔ القاء ہونے کا زمانہ

حضرت عیسیٰ سے دور ہے اور قلمبند ہونے کا زمانہ انقلاب ہونے کے زمانہ سے مختلف، شرق اردن میں جو دستاویزیں برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی فرقوں کے عقائد حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں پیوست ہو گئے ہیں جس سے قرآن کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ موجودہ مسیحیت حضرت عیسیٰ کی تعلیم نہیں بلکہ اس کی تحریف شدہ شکل ہے۔

عیسائیوں کی تعداد اس وقت ۷۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور اس وقت وہ تین بڑے فرقوں میں منقسم ہیں۔ (۱) مشرقی تقلید پسندی (۲) رومن کیتھولک اور (۳) پروٹسٹنٹ۔ ان سب سے بڑا فرقہ رومن کیتھولک ہے جس کا مرکز روم اور رہنما پاپائے روم ہے۔ مشرقی تقلید پسندی کا مرکز روس ہے اور پروٹسٹنٹ یورپ اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔

اسلام

اکثر لوگ اسلام کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اسلام وہی مذہب ہے جس کی تبلیغ واشاعت حضرت آدم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر پیغمبر نے کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب درحقیقت مسلمان تھے لیکن بعد میں ان کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات مسخ کر ڈالیں۔ عیسائیت اور یہودیت درحقیقت اسلام کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

"اسلام کے لغوی معنیٰ ہیں۔ اطاعت، اصطلاحاً یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام خدا کی اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ کائنات کی ہر چیز چاند، سورج، ستارے، درخت، خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تابع اور مطیع ہیں، اس اعتبار سے وہ "مسلم" ہیں۔ انسان بھی اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں چار و ناچار خدا کا مطیع ہے۔ اس کا جسم، اس کا ذہن، اس کی خواہشات یہ سب ان قوانین کے ماتحت ہیں جو خدا نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو خدا نے انسان کے ارادے اور شعور پر چھوڑ دیا ہے جو لوگ اپنی اس شعوری اور ارادی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہونے کا فیصلہ کریں انہیں "مسلم" کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مسلم کسی خاندان یا ذات کا نام نہیں۔ ایک نظریہ حیات کا نام ہے۔

اسلام جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ ہر انسان سے کرتا ہے ان میں اہم ترین" ہیں۔ توحید

رسالت اور آخرت۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان خدا ئے تعالیٰ کو تسلیم کرے اور یہ مانے کہ اس کے سوا کوئی عبادت و اطاعت کا حقدار نہیں ہے۔ رسالت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ ان انبیاء یا پیغمبروں پر ایمان لائے جن کے ذریعے خدا نے اپنا پیغام ہم تک پہنچایا ہے۔ ان انبیاء میں سے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عقیدہ آخرت کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ زندگی کے خاتمے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کے اعمال کے اعتبار سے انہیں سزا یا جزا ملے گی۔

ان عقیدوں کے علاوہ اسلام جن عملی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے ان میں پانچ وقت کی نماز، سال میں ایک ماہ کے روزے، عمر میں کم از کم ایک بار حج، سالانہ زکوٰۃ اور فریضہ جہاد فی سبیل اللہ کی ادائیگی شامل ہیں۔

چونکہ اس پوری کتاب میں اسلام کے نظام زندگی کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے اس باب میں اسلام کی تعلیمات کا انتہائی مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۷۵ کروڑ سے زیادہ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے اور یہ وہ واحد مذہب ہے جس کے پیرو دنیا کے تمام بر اعظموں میں پائے جاتے ہیں۔ نیز اس وقت اقوام متحدہ کے ۱۴۰ ممبر ملکوں میں سے ۴۴ مسلمان ممالک ہیں۔ بیسویں صدی میں سامراج کے خلاف سب سے موثر جنگ مسلمانوں ہی نے کی ہے اور اسی جدوجہد کے نتیجے میں اب ان کے ۴۳ آزاد ملک موجود ہیں۔

ایک تقابلی مطالعہ

اوپر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر چکے ہیں۔ ان سب کے مطالعے کے بعد فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ موجودہ دور میں ان مذاہب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ مذاہب اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں؟ کیا ان کی کتب جن پر ان کا مدار ہے پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہیں؟ کیا یہ مذاہب موجودہ دور کی ترقیوں کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ اور آج کی دنیا میں کوئی موثر تعمیری کارنامہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا یہ قابل عمل ہیں؟ کیا یہ انسان کو ایک مکمل نظام

حیات عطا کر سکتے ہیں۔

کتب کی حفاظت کے معاملے کو لیجیے۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب وید وں کا زمانہ ہی آج تک متعین نہیں ہو سکا۔ خود ہندو اس کی عدم صحت کے معترف ہیں اور اب ان میں سے اکثر پڑھے لکھے لوگ اس کو الہامی کتب کی بجائے انسانوں کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ بدھ مت کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ گوتم بدھ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی صرف ان کی زبانی تعلیمات تھیں۔ جو سینہ بہ سینہ چلتی رہیں اور سینکڑوں سال کے بعد جاکر مدون ہوئیں۔ یہودیوں کی کتاب مقدس توراۃ کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کے بارے میں بے شمار تاریخی شہادتیں ملتی ہیں کہ یہ کتاب طویل طویل عرصوں کے لیے بالکل نیست ونابود ہو گئی تھی۔ مثال کے طور پر بخت نصر نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ توراۃ کا صرف ایک نسخہ تھا جو ہیکل میں تھا اور وہ تباہ و برباد کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ بخت نصر پوری یہودی قوم کو بابل پکڑ کر لے گیا۔ جہاں انہیں اپنی مذہبی رسموں کے بجا لانے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ ایران کے بادشاہ سائرس نے جب بابل فتح کر کے یہودیوں کو رہائی دی تو پھر انہوں نے نہ جانے کہاں سے توراۃ کا ایک نسخہ ڈھونڈ لیا۔ اس کے بعد بھی کم از کم تین مرتبہ توراۃ کا نسخہ دنیا سے بالکل تباہ کر دیا گیا اور پھر یہودیوں نے دوبارہ پیدا کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں ہو گئیں۔ تحریفات کا ایک معمولی اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجہیز و تکفین کے واقعات تک درج ہیں۔

یہی معاملہ انجیل کا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوشش کی اور انہی کوششوں کا نتیجہ بائبل کی صورت میں نمودار ہوا اس زمانے میں اس قسم کی اناجیل کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک روایت کی رو سے اس طرح کی ۴۴ اناجیل کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد حواریوں کے خطوط کی ہے۔ ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل کے سامنے یہ سارا لٹریچر رکھا گیا۔ کافی جنگ و جدال کے بعد ان ساری انجیلوں کو اوپر تلے رکھ دیا گیا اور صبح آکر دیکھا گیا تو چار انجیل اور کچھ خطوط کو چھوڑ کر باقی سب نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ ان ہی چار اناجیل متی، لوقا، مرقس اور یوحنا کو صحیح قرار دیا گیا۔ ان کے ساتھ ساتھ

کچھ خطوط بھی بچے تھے انہیں بھی درست قرار دیا گیا۔ ان کے بقیہ کی انجیل کا آج بھی پتہ نہیں آج کل قدیم ترین انجیل چوتھی یا پانچویں صدی کی ملتی ہے وہ بھی یونانی زبان میں جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان آرامی تھی۔

اس سب کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اپنی اصل زبان (عربی) میں آج تک اسی صورت سے محفوظ ہے جیسے وہ اترا تھا۔ قرآن دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی زمانے میں مرتب ہو گیا تھا۔ اس کے صحابہ کرام نے اس کے مختلف نسخے کرا کے مختلف جگہوں پر بھیجے۔ چنانچہ اس کے قدیم ترین اور جدید نسخوں میں ایک شوشے کا فرق بھی نہیں ملتا۔ اسلام کے کٹر مخالف بھی اس بات کے معترف ہیں کہ قرآن ہر قسم کی تحریف سے پاک اور منزہ ہے۔

اس کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ یہ مذاہب کس قسم کا نظام زندگی پیش کرتے ہیں اور وہ اس دنیا کے قابل عمل ہیں یا نہیں؟ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بعض مذاہب سرے سے نظام زندگی ہی نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر بدھ مت یا عیسائیت مکمل نظام زندگی نہیں۔ ان دونوں مذاہب کا موضوع محض اخلاق ہے۔ لہٰذا یہ انسان کی زندگی میں وہ توافق اور ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتے جو کوئی جامع نظام حیات کر سکتا ہے۔ ہندومت اور یہودیت بلاشبہ اس اعتبار سے بہتر ہیں کہ وہ زندگی کے لئے ضابطۂ اخلاق سے آگے بڑھ کر بھی تھوڑی بہت ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن ہندومت میں ذات پات کی تقسیم اور صرف ہندوستان تک محدودیت کی وجہ سے اس بات کی مطلق صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس دور کو متاثر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں منوسمرتی کے قوانین کی بجائے نئے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہودیت ایک نسل تک محدود ہے۔ یہودی خود بھی تبلیغ نہیں کرتے اور نہ ہی یہ بات زیادہ پسند کرتے ہیں کہ کوئی ان کا مذہب اختیار کرے لیکن ہندومت اور یہودیت بھی درحقیقت ایسا جامع و مانع نظام زندگی نہیں جو آج کے دور یا آئندہ کے ادوار میں انسانیت کی رہنمائی کر سکے۔ اس کی وجہ ان کے قوانین کی سختی اور ان میں لچک کی کمی ہے۔ بدھ مت اور عیسائیت تو انسان کی اجتماعی زندگی سے علاقہ ہی نہیں رکھتے لہٰذا لامحدود آزادی دے دیتے ہیں۔ باقی ہندومت اور یہودیت بے لچک ہونے کی وجہ سے ترقی پذیر نہیں ہیں۔ اور اس بناء پر زمانے کے ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ پھر ان میں

سے کوئی مذہب بھی اپنے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ ہندومت اور بدھ مت کے سلسلہ میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی یہودیت اور عیسائیت تو ان کی مقدس کتب بھی شاہد ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دی تھی جو دین کو مکمل کرے گا۔ حضرت موسیٰ کا ارشاد ہے۔

"میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" (استثنا ۱۸ - ۱۹)

دوسرے الفاظ میں حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ان کے بعد ایک اور نبی آئے گا جو صاحب شریعت ہوگا اور جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"لیکن وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) پاکیزگی کی روح ہے۔ جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴، ۲۶)

نیز یہ کہ:

"اور وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں، پر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔"

(یوحنا ۱۶-۸)

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو نامعلوم قرار دیا اور اس امر کا پتہ دیا کہ دین کو مکمل کرنے والا ابھی آئے گا۔

اس کے برعکس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا وہ مکمل ہے اور

انسانیت کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ وحی الٰہی نے آپ کی زبان مبارک سے پوری انسانیت کے لئے عام اعلان کرایا کہ:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (مائدہ رکوع ۱)
آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا۔

اسلام کی تعلیمات نہایت جامع ہیں۔ اسلام انفرادی زندگی کے لئے بھی ہدایات دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے بھی۔ اسلام میں جتنی اہمیت اخلاقی نظام اور عبادت کی ہے اتنی ہی اہمیت سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی نظام کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ انسان کو لامحدود آزادی دی گئی ہے اور نہ اسے بے انتہا جکڑ کر رکھا گیا ہے۔ قرآن اور سنت کے ذریعے زندگی کے بنیادی اصول متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصول کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے تحت قوانین مدون کئے جا سکتے ہیں۔ اس حکیمانہ نظام کی بناء پر اسلام میں ہر دور کا ساتھ دینے کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

دورِ حاضر
کی
تحریکیں
اور
مذہب

دورِ حاضر کی تحریکیں اور مذہب

مغربی ممالک ہمیشہ سے اس قدر متمدن اور ترقی یافتہ نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ مغربی تہذیب اپنی موجودہ شکل میں صرف پانچ سو سال قدیم ہے۔ یورپ میں اس سے پہلے کا زمانہ "دور تاریک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت نہ تو تہذیب و تمدن کا نور تھا اور نہ علوم و فنون کی روشنی۔ اس باب میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اس پس منظر سے جدید تہذیب کس طرح رونما ہوئی۔ کن ماخذ سے اس نے اکتساب کیا؟ کن بنیادوں پر وہ استوار ہوئی؟ کن کن تحریکات کو اس نے جنم دیا؟ اور بحیثیت مجموعی اس کے تسلط سے انسانیت نے کیا پایا اور کیا کھویا؟

جدید تہذیب کا ارتقاء

کسی تہذیب کی روشنی یا ظلمت دراصل نتیجہ ہوتی ہے اس کے اصول و عقائد، اخلاقی اقدار اور سماجی اداروں کا، یہی وہ عناصر ترکیبی ہیں۔ جن کے مجموعے کا نام تمدن ہے۔ ان عناصر میں کچھ اثر پذیر ہوتے ہیں اور کچھ اثر انگیز۔ جو عناصر اثر انگیز ہوتے ہیں، دراصل وہی کسی دور کی مخصوص تہذیب کا ڈھانچہ متعین کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان عناصر کو عصری تحریکات کا نام دیا جاتا ہے۔ جدید عصری تحریکوں میں پانچ عناصر تہذیب کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ فلسفۂ مادیت، نظریہ الحاد، حاکیت جمہور، جذبہ قوم پرستی اور حیوانی ازدواج کا نظریہ یہی وہ قوائے خمسہ ہیں جو جدید تہذیب کی بلند و پر شکوہ عمارت کو سہارا دیئے ہوئے ہیں اور یہی وہ برقی قمقمے ہیں جن سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نکل رہی ہے۔

ان جدید عصری تحریکوں کو بخوبی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سرسری طور پر ان کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے۔

عناصر تہذیب دو عوامل کے پیدا کردہ ہیں۔ ایک تو ماضی کے اثرات اور دوسرے اس دور کے

مخصوص حالات، موجودہ تہذیب بھی انہی دو عوامل کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک یورپ کے ماضی کا تعلق ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اہلِ یورپ فکر میں قدامت پسند اور مذہب میں گمراہ تھے۔ مسیحیت بہت پہلے اپنی اصلی شکل کھو چکی تھی اور اس کی جگہ جس چیز کو آفاقی مذہب کا نام دیا جاتا تھا وہ چند نامعقول اوہام اور کچھ غیر فطری ریاضتوں کا مجموعہ تھا۔ ان اوہام کے علاوہ ہر نئی فکر ایجاد اور ہر نیا خیال کفر سمجھا جاتا تھا۔

سیاست اور معیشت میں جاگیردارانہ نظام حاوی تھا۔ ہر ملک چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں منقسم تھا اور ہر جاگیردار اپنے علاقے میں خود مختار، جاگیردار اپنے "آدمیوں" کے ارادہ و عمل پر کلی اختیار رکھتا تھا۔ اس کے زیرِ حکم افراد اگرچہ اصطلاحی معنوں میں اس کے غلام نہ تھے لیکن ان کی حیثیت غلاموں سے کسی طرح بہتر بھی نہ تھی۔ ایک نیم غلام کاشتکار کو اپنی زمین چھوڑ کر جانے کا حق نہ تھا۔ اور اسے کاشت پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ وہ معاشی اور سماجی ہر لحاظ سے جاگیردار کے دستِ نگر تھے۔ کاشتکاری واحد پیشہ تھا۔ صنعت و حرفت برائے نام تھی۔ اور چونکہ کسی قسم کی منظم صنعت نہ تھی اس لئے تجارت بھی غیر موثر تھی۔

معاشرہ میں صرف دو طبقے تھے۔ ایک امراء اور جاگیرداروں کا جس میں اصحاب جائداد اور مذہبی پیشوا شامل تھے۔ اور دوسرے نیم غلام عوام۔ ان دو طبقات کی زندگی میں عظیم تفاوت تھا۔ ایک کی زندگی اگر مکمل ساز تھی تو دوسرے کی مکمل سوز، ایک مینا و جام سے دل بہلاتا تھا تو دوسرا نانِ شبینہ کا محتاج تھا، ایک مخمل و کمخواب زیب تن کرتا تو دوسرا پھٹے چیتھڑوں کو ترستا تھا۔

جنگ جاگیرداروں کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتے۔ اس زمانہ میں چونکہ مستاجر سپاہیوں کا دستور نہ تھا۔ اس لئے معمولی کسان بھی اس بات پر مجبور تھے کہ اپنے آقا کی جانب سے اپنے خرچ پر جنگ میں شریک ہوں۔ کسان ایک تو ویسے ہی تنگدست تھے پھر ہمہ وقتی جنگوں نے تو ان کی کمر بالکل ہی توڑ دی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ ان تمام ناانصافیوں اور زیادتیوں کو برحق ثابت کرنے کے لئے سہارا مذہب ہی کا لیا جاتا تھا۔ اس دور کا مسخ شدہ مذہب ایک ایسا ملمع بنا ہوا تھا جس کو ہر قبیح اور بدنما چیز پر چڑھا کر خوشنما اور قابلِ قبول بنایا جا سکتا تھا۔ وہ

برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ میں حقیقتاً ایک ایسا ہتھکنڈہ تھا جس سے یہ طبقہ اپنی ہر جائز و ناجائز غرض پوری کرتا۔

یہ حالات تھے کہ جب مسلمانوں نے یورپ کے کچھ حصے کو فتح کیا اور باقی کچھ حصے سے تجارتی تعلقات استوار کیئے۔ اس دور کا مسلمان علم و ہنر کا دلدادہ اور صنعت و حرفت کا ماہر تھا۔ مسلمانوں سے تعلقات کی بناء پر یورپ کے عیسائیوں میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا اور ان میں سے کچھ نے مسلم علماء اور قدیم یونانی فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں علوم و فنون کی تجدید ہوئی۔ تاریخ کی اصطلاح میں اس تجدید کو نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس مطالعہ کی بناء پر یورپ کے عیسائیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی۔ ان کی نظر میں غیر معقول نظریات کھٹکنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے جاہلانہ اوہام کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں نے ان سب پر ارتداد کا فتویٰ لگاکر نہایت سخت سزائیں دیں۔ ایک اندازہ کے مطابق کلیسا کے سزا یافتہ افراد کی تعداد تین لاکھ سے کسی طرح کم نہیں۔ ان میں سے ۳۲ ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہی زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت اور طبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی ہے۔ جس کا سب سے بڑا جرم ارباب کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ اسی طرح مشہور طبعی عالم گلیلیو کو بھی اس بناء پر قید و بند کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔

اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچا دی۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کلیسا سے وابستہ تھے۔ سب کے سب کلیسا سے نفرت کرنے لگے۔ اور عداوت کے اس جوش میں بدقسمتی سے انہوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہہ و بالا کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ وہ جنگ جو شروع شروع میں عیاش قسم کے اہل کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف بھی شروع ہو گئی اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف۔ ان آزاد خیال اور تجدد پسند لوگوں میں اتنا صبر و ضبط، غور و مطالعہ کی قوت اور تعقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور

دین کی غلط نمائندگی کرنے والوں کے درمیان تمیز کر سکتے۔ انھوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ سوچنا تک گوارہ نہ کیا کہ ان نفرت انگیز واقعات کا مذہب کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک اس مذہب کے نام لیواؤں کی ذاتی حرص و جہالت، چنانچہ غصہ میں آکر وہ ہدایت الٰہی ہی کے باغی ہو گئے۔ گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کش مکش شروع ہوئی جس میں چپڑا در رضد سے بہک کر "تبدیلی" کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔ اس طویل کش مکش کے بعد مغرب میں تہذیب الحاد کا دور دورہ شروع ہوا۔

علوم و فنون اور صنعت و حرفت بہرحال پھلتے رہے اور صنعت کی اسی روز افزوں ترقی کی بناء پر معاشرہ میں ایک تیسرے طبقہ نے جنم لیا۔ اس طبقہ میں کاریگر، صنعت کار، ساہوکار اور تاجر شامل تھے۔ جیسے جیسے صنعت و تجارت میں اضافہ ہوتا گیا اس طبقہ کے افراد بھی بڑھتے گئے۔ ہر چند کہ مملکتیں ابھی تک جاگیروں میں منقسم تھیں۔ لیکن صنعت کار اور تاجر کا مفاد اسی میں تھا کہ ان مصنوعی سرحدوں کا جس قدر جلد ممکن ہو سکے خاتمہ ہو۔ چنانچہ اس طبقہ نے جاگیردار کی عائد کردہ پابندیوں سے رفتہ رفتہ چھٹکارا حاصل کرنے کی مستقل کوشش کا آغاز کیا۔ شہر میں تاجروں کی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا جن کا بڑا مقصد اسی کوشش کو منظم کرنا تھا

جاگیردارانہ نظام کی مناسبت سے قرونِ وسطیٰ میں سیاسی اختیارات بادشاہ اور جاگیردار میں منقسم تھے اور اسی بناء پر بادشاہ اور اس کے نوابوں میں اقتدار کی رسہ کشی رہتی تھی۔ بادشاہ ملک کے انتظام میں زیادہ سے زیادہ دخل رکھنا چاہتا تھا۔ اور جاگیردار اس کے اختیارات کو کم سے کم کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ تاجر طبقہ کو اپنا مفاد اسی میں نظر آیا کہ جاگیروں کی سرحدوں کا خاتمہ کرنے اور اپنی تجارت کو وسیع تر کرنے کے لئے وہ ہر طرح سے بادشاہ کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ یورپ کے تقریباً ہر ملک میں اس طبقہ نے بادشاہ کا ساتھ دے کر کہیں بالقوۃ اور یک لخت اور کہیں بلا جبر اور تدریجی طور پر جاگیرداروں کو ان کے سیاسی حقوق سے بے دخل کر دیا اور اس طرح قومی ریاست کی بنیاد پڑی۔

قومی ریاست کے قیام سے قبل ہی یورپ کے ممالک میں جذبہ قومیت کا آغاز ہو چکا تھا کلیسا کی بدانتظامی اور پوپ کی بدعملی کے خلاف احتجاج کرنے والے دو گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ایک وہ جنہوں نے اسی بدانتظامی اور بدعملی کا ذمہ دار خود مذہب کے وجود کو ٹھہرایا، اور دوسرے وہ جو مذہب کے خلاف تو نہ تھے لیکن ان کے نزدیک اصل سبب پورے یورپ کے لئے ایک مشترکہ چرچ اور ایک ہی پوپ کا وجود تھا۔انہوں نے پاپائے روم کی برتری اور اقتدار کا انکار کیا اور قومی چرچ کی کلی خود مختاری کی پرزور تائید کی۔تاریخ میں یہ تحریک اصلاح، مذہب کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔چنانچہ اس لحاظ سے میکاولی جیسا منکر مذہب ہو یا لوتھر جیسا مؤید مذہب دونوں ہی نے جذبۂ قوم پرستی کی توسیع و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہ قومی ریاستوں کے قیام کے ساتھ دخانی انجن کی دریافت اور اس کے وسیع استعمال سے صنعتی پیداوار میں کثیر اضافہ ہوا اور اس صنعتی پیداوار کی فروخت کے لئے تجارتی منڈیوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔چنانچہ یورپ کی بہت سی قومیں اسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے گھروں سے نکل پڑیں۔اس تگ و دو میں مسابقت کے جذبہ کا ابھرنا بالکل ایک فطری امر تھا۔مگر اسی مسابقت نے باہمی رقابت کی صورت اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔اس آڑے وقت میں جس نظریہ نے لوگوں کو سرگرم عمل کیا اور انہیں لڑنے مرنے پر ابھارا، وہ قومیت کا نظریہ تھا۔مغربی انسان نے اس نئے بت کے تراشے جانے کے بعد کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جگہ پیشانیاں اب اس پیکرِ محسوس کیا۔کے سامنے جھکنے لگیں اور انسان اپنی زندگی میں بندگی کا جو خلا محسوس کر رہا تھا وہ پر ہو گیا۔فرد فرد میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

غرض یہ کہ وہ لوگ جو مذہب کو کسی خاص شکل میں ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتے تھے بالواسطہ طور پر خود بھی اس کے خاتمہ کا سبب بنے اور اس طرح جذبۂ قوم پرستی کے راسخ ہو جانے کے بعد تہذیب مغربی بہت جلد اپنے مزاج کی دوئی سے پاک ہو گئی۔فلسفہ۔

اخلاق، معیشت، سیاست ہر جگہ سے مذہب کو بے دخل کر دیا گیا۔ مشاہدہ و تجربہ علم کا واحد ذریعہ بنے، بہران دیکھی چیز کا انکار روشن خیالی کا ثبوت قرار پایا۔ اخلاق کا معیار ذاتی منافع سمجھا گیا زندگی اور موت کا عقیدہ باطل گردانا گیا، قانون سازی کی راہ میں الہامی اور اخلاقی رکاوٹوں کو جہالت اور نادانی پر قیاس کیا گیا اور اس طرح پوری زندگی کو غیر مذہبی اور مادی بنا دیا گیا۔

تہذیب جدید کے عناصر ترکیبی

اس عمل اور رد عمل سے جو تہذیب ظہور میں آئی اس کا جو ہر بھی عناصر خمسہ ہیں جن کے تاریخی ارتقاء کا مختصر جائزہ ہم نے اوپر لیا۔ مناسب ہوگا اگر ہم یہ بھی معلوم کریں کہ مغربی تہذیب میں ان کا صحیح مقام کیا ہے۔

(۱) فلسفہ مادیت

فلسفہ مادیت سے مراد دو چیزیں ہیں۔ اول ایک خاص مابعد الطبیعیاتی (یا زیادہ صحیح معنوں میں طبیعیاتی) نظریہ جو عبارت ہے زندگی کے میکانکی تصور سے اور دوئم مادیت کا اخلاقی نظریہ۔ پہلے نظریہ کے مطابق دنیا میں مادہ کے سوا کوئی چیز حقیقی نہیں حتیٰ کہ انسان کا شعور و ارادہ بھی برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے اور اس کائنات کو سمجھنے کے لئے طبعی قوانین کے علاوہ کسی چیز کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں۔ مادیت کے اخلاقی نظریہ کے مطابق، جو حقیقتاً مادیت کے مابعد الطبیعاتی نظریہ ہی کا منطقی نتیجہ ہے، انسان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف جسمانی احتیاجات کی تسکین ہے۔ لہٰذا قابل غور شے وہی ہے جو ان ضروریات کی تکمیل کرے۔ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ انسانی کوششوں کا مقصود بھی صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر لذت و منفعت کا باعث ہو۔ یہ طرز فکر کسی حد تک یورپ کی عملی زندگی میں دخل رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ ایک مغربی مفکر کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرتا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ہو، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور

وہ مادی ترقی کی پرستش ہے اور اس کی غایت حیات صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان، پر راحت اور عام محاورے کے مطابق فطرت سے آزاد بنا سکے۔"

(ب) لادینیت مادی طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ لادینیت ہے۔ اگر مادہ ہی سب کچھ ہے اور اگر یہ کائنات خود بخود پیدا ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کا نہ کوئی خالق ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ناظم، پھر جب کوئی خالق و ناظم ہے ہی نہیں تو اعمال کا حساب اور ان کی جزا اور سزا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میکانکی تصورِ حیات کے غلبہ کے بعد مغربی ممالک کے نسبتاً کم لوگ صحیح معنوں میں خدا کے قائل ہیں۔ اپنے مذہب سے والہانہ محبت کے باوجود لادینی خیالات کے غلبہ کی وجہ سے وہ دوسرے مذاہب سے وہ تعصب و عناد کے علاوہ اور کسی طریقہ فکر پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے اور زندگی کے عام دھارے کو موڑ نہیں سکے۔

(ج) حاکمیتِ جمہور فلسفۂ مادیت کا دوسرا منطقی نتیجہ حاکمیت انسان ہے۔ اگر یہ دنیا بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئی اور اگر اس کا کوئی مالک و آقا بھی نہیں ہے تو کسی ایسی ہستی کا ذکر کرنا بھی بے سود ہے جس سے کسی قسم کی ہدایت اور رہبری کی امید کی جا سکے۔ لہٰذا انسان خود ہی اپنا مالک ہے۔ جس طرح وہ چاہے اصول وضع کرے اور جس اصول کو چاہے توڑے۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ مختلف انسانوں کے خیالات میں عظیم اختلاف ہوتا ہے۔ رائے مانی جائے تو کس کی؟ اقتدار تسلیم کیا جائے تو کس کا؟ اس کے جواب میں ایک خیالی شے کی دریافت کی گئی جس کا نام روسو نے رائے عامہ تجویز کیا۔ حاکمیت انسان کا تصور عملی طور پر حاکمیت جمہور کا تصور بن گیا۔ اس کا منشا یہ ہے کہ قوم کے عوام اپنی خواہشات اور آرام میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں، وہ جس چیز کو چاہیں اپنے لئے خود حلال یا حرام ٹھہرا سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلہ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ حاکمیت بھی انہی کی ہونی چاہیئے۔ اس فلسفہ کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم کی دوئی کو مٹا دیا ہے اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔

بظاہر یہ نظریہ نہایت ہی معقول معلوم ہوتا ہے اس کی رو سے عوام کو بادشاہوں کے ظلم و ستم

سے نجات حاصل ہوئی۔ انہیں یہ حق نصیب ہوا کہ وہ اپنی بہتری کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کر سکیں مگر حاکمیت کو عوام کے ہاتھوں میں اس طرح دے دینے کے بعد بھی انسانیت کے حقیقی مصائب ختم نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ رائے عامہ محض ایک فریب ہے۔ انتخاب اور استصواب کے باوجود جو رائے حقیقتاً نافذ ہوتی ہے وہ یا تو کسی آمر کی ہوتی ہے یا چند برسرِ اقتدار افراد کی۔ الفرڈ کابن نے بالکل درست کہا ہے کہ عوام کو حاکمیت کا سونپ دیا جانا ان کو وہی حقوق عطا کرنا ہے جو حقوقِ ربانی کے نظریہ کی رو سے ازمنہ وسطیٰ میں بادشاہوں کو حاصل تھے اور اس طرح جن جن بے اعتدالیوں کے پرانے بادشاہ مرتکب ہوتے تھے انہی بے اعتدالیوں کا ارتکاب آج حاکمیتِ جمہور کے نام پر دنیا کا ہوشیار طبقہ کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمہور کو دوسروں کے ظلم سے نجات حاصل ہونی چاہیئے اور انہیں اس کا اختیار ہونا چاہیے کہ کوئی ان کے جائز مفاد و حقوق کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ لیکن خود ان کی فلاح کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے لئے شمعِ راہ ایسے اصول و احکام ہوں جو انصاف و فلاح کے حامل ہوں اور جن میں کسی کی خود غرضی یا کج روی کو دخل نہ ہو۔ یہ مرتبہ دینِ حق کو ہی حاصل ہو سکتا ہے اور اسی کی رہبری اور اس کے اصول کی پابندی اپنے اوپر عائد کرنے سے ہی جمہور فلاح پا سکتے ہیں۔

(۷) **جذبہ قوم پرستی** قوم پرستی ایک ایسا جذبہ ہے جو مذہب کے خاتمہ کے بعد اجتماعی نصب العین اور اتحادی عامل کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسیحیت یورپ کے مختلف ممالک کو جوڑنے والی قوت تھی۔ اس اشتراک کی بناء پر پورا یورپ باوجود سیاسی تقسیم کے ایک وحدت تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن مذہب کے کلی استیصال کے بعد قوم ہی اصل وحدت قرار پائی۔ اس عقیدہ کے مطابق قوم کو وہی درجہ حاصل ہے جو مذہب میں شارع کو دیا گیا ہے۔ قوم خطا و نسیان سے معصوم ہے اس سے لغزش اور غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد اس کی ملک ہیں اور ان پر اس کی اطاعت فرضِ عین ہے۔ اس کو حق ہے کہ جس امر میں جو چاہے فیصلہ کرے۔ فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف قوم کے لئے ہے اور اس میں کوتاہی کفر سے کم نہیں۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قوموں اور ملکوں نے اپنے سیاسی تسلط اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچے تھے ان کی حدود سے نکل کر سوچنا ان کے لئے قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ انہوں نے ہر اس چیز کو باطل خیال کیا جو ان کی ملک وطنی سے تعلق نہ رکھتی تھی یہ قوم پرستانہ ذہنیت تو یہاں تک بڑھ گئی کہ قوموں نے کسی غیر ملک سے آئی ہوئی ان اعلیٰ اقدار کو ماننے سے

بھی انکار کر دیا جن کو خدا کے پاک بندوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے مفاد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ پوری نوع انسانی کی فلاح مطلوب تھی۔ جرمنی کے ایک پروفیسر اٹو نے کے یہ الفاظ اس ذہنیت کی پوری غمازی کرتے ہیں:۔

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں، انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں؟ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیے" ان نظریوں سے جو بربادیاں واقع ہوئیں وہ تاریخ کے صفحات کو خونیں بنانے میں پیش پیش ہیں۔

(ھ) **حیوانی ازدواج کا نظریہ** اس خطرناک فلسفہ کے معنی یہ ہیں کہ شرم و حیا اور عصمت و عفت، جن کو انسان اب تک قابل قدر صفات سمجھتا رہا ہے وہ سب اضافی ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی حیثیت ماضی کے افسانوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ درحقیقت یہ وہ زریں جال ہیں جو عورت کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ وہ ان کی بوسیدہ رسیوں کو توڑ کر آزاد ہو جائیں۔ عورتیں ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہیں انہیں زندگی کی دوڑ دھوپ میں برابر کا شریک ہونا چاہیئے۔ خانہ داری کے فرائض میں مقید رہنا غیر فطری ہے۔ جنس ایک حیوانی جذبہ ہے جس کی تکمیل کے لئے نہ کسی خاص انتظام کی ضرورت ہے اور نہ اس سے زن و شوہر کے مختلف کردار کی دلیل فراہم ہوتی ہے۔ اس باطل فلسفہ کا اثر یہ ہوا کہ پہلے تو نکاح کی گرفت ڈھیلی ہوئی، اس کے بعد نکاح سے عام بیزاری کا رجحان پرورش پانے لگا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت پیوند خاک ہو گئی۔ اس کی تباہی نے انسانی معاشرہ پر جو اثرات ڈالے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف۔ بچوں کی تربیت اور نگہداشت سے عام لاپرواہی۔ ب۔ صنفی نزاع

اس سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ ہم اسی تہذیب کے چند سربرآوردہ داعیوں کی آرا پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ خود اس کے متعلق کس طرز پر سوچتے ہیں۔ چنانچہ عہد جدید کا ایک مفکر الیکس کیریل لکھتا ہے

"موجودہ سماج نے سب سے فاش غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تربیت کے لئے خاندان کے مقابلے میں مدرسوں پر اعتماد کیا۔ آج کی ماں اپنے بچے کو نرسری اسکول میں صرف اس غرض کے لئے چھوڑ آتی ہے کہ وہ اپنی معاش کے لئے آزاد شہوت رانی کے۔ لئے فضول قسم

کی آرٹ پرستی کے لئے اور برج کھیلنے یا سینما جانے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت بچا سکے اور اس طرح ایک طرح کی مشغول بیکاری میں منہمک رہے۔ اس طرز زندگی نے خاندان کے نظام کو جس کے زیر اثر رہ کر بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے، بالکل درہم برہم کر دیا۔"

حیوانی ازدواج کے اس فلسفہ نے جہاں ایک طرف خاندانی نظام کو تباہ و برباد کیا ہے وہاں اس نے فطرت کی طرف رجعت کے رنگین پردے میں صنفی بے اصولی کا بیج بو دیا۔ اس نے لوگوں کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں یہ درس دیا کہ آزاد محبت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں محض مصنوعی ہیں اور تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کا ہر ہوٹل، ہر پارک، ہر محلہ بداخلاقی کا مرکز بن گیا۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں۔

روس بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ اشتمالیت نے وہاں اخلاقی سطح کو اور بھی پست کر دیا ہے۔ اشتمالی رہنماؤں نے زیادہ زور اسی بات پر دیا ہے کہ کوئی چیز بھی اشتمالی سوسائٹی کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ جنسی عمل میں انسان کو اس کے مذاق اور طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور آزاد جنسی تعلقات کی استواری کے کلی اختیارات اسے تفویض کر دیئے گئے ہیں۔ اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے شہروں میں جہاں اشتمالی اخلاقیات اور صنفی انارکی کا براہ راست اثر پڑا وہاں اخلاقی اقدار بالکل مٹ گئی ہیں۔

انہی حالات کی بناء پر علم طبیعیات کی مشہور ماہر مسز ہٹسن شا مغرب پر بحیثیت کل تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"ہماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہو جائے۔ ہم گذشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم و ضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کی بقا کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کر دی جائے۔"

معاشرتی ارتقاء کا تصور اور اسکے نتائج

"تہذیب الحاد کے ان سارے عناصر نے اچھے احساسات، پاکیزہ جذبات اور اخلاقی اقدار کو تباہ کرنے میں جو حصہ لیا ہے۔ اس سے بڑھ چڑھ کر کام معاشرتی ارتقاء کے تصور نے کیا ہے یہ نظریہ مادیت پرستی کے بطن سے پیدا ہوا، الحادی طرزِ فکر نے اسے پروان چڑھایا اور زمان و مکان پر انسانیت کی فتح نے قبولِ عام بخشا۔ اس کے فروغ کے ساتھ ہی ظلم نے انصاف کا اور شیطنت نے شرافت کا روپ دھار لیا۔ پھر خونریزی، سفاکی اور کمزور کشی اخلاق عالیہ قرار پائے یوں تو اس نظریہ کی پرورش میں بے شمار اصحابِ فکر نے حصہ لیا ہے لیکن ہیگل، مارکس اور ڈارون کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ذیل میں ہم انہی مفکرین کے افکار کے مختصر مطالعہ کے بعد اس نظریہ کے معاشرتی نتائج کا جائزہ لیں گے۔

(۱) ہیگل فلسفہ کی فنی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اضداد کے ظہور، تصادم اور امتزاج سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی کا ہر دور ایک وحدت ہے، ایک کل ہے۔ اس دور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے ایک خاص مرتبہ پر ہوتے ہیں، ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے اور یہ عناصر ایک عصری وحدت کے رخِ زیبا کا عکس ہوتے ہیں۔ جب تاریخ انسانی کا قافلہ "روحِ مطلق" کے اشارے پر کچھ قدم آگے بڑھتا ہے تو خود اس کے اپنے قافلے میں سے کچھ حریفانہ افکار، رجحانات اور نظریات علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں آجاتے ہیں ان دونوں کے درمیان ایک زبردست لڑائی شروع ہوتی ہے۔ مگر کچھ مدت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد ان میں آخرکار صلح ہو جاتی ہے۔ اور دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر چھانٹ کر علیٰحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایسی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ وحدت ایک بالکل نئے نظامِ فکر و عمل کی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے لیکن کچھ مدت گزر جانے کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے اور انسانی تہذیب اس طرح ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔

نظامات فکر وعمل اور عناصر تہذیب کا یہ ٹکراؤ عملاً اقوام کے ٹکراؤ کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہیگل کے مطابق ہر قوم ایک خاص کلچر کا مظہر اور ایک خاص فکر کی حامل ہوتی ہے۔ لہٰذا افکار کا تصادم دراصل اقوام کا تصادم ہے اور اسی بنا پر ہیگل اقوام کے مستقل پیکار کو انسانی ترقی کے لئے ایک لازمہ قرار دیتا ہے۔

(ب) مارکس کارل مارکس نے اپنا فکری خاکہ ہیگل سے مستعار لیا مگر اس میں خود اپنے وجدان سے رنگ بھرا۔ اس نے روح کے تصور کو الگ کرتے ہوئے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخی ارتقاء کی بنیاد قرار دیا۔ ہیگل کے نزدیک اگر موثر طاقت افکار کی ہے تو مارکس کے نزدیک اصل اور فیصلہ کن قوت صرف مادی ماحول ہے اور اس میں بھی حقیقی اہمیت ذرائع پیداوار کو حاصل ہے۔ مارکس کے مطابق پیدائش دولت کے مختلف طریقے ہی کسی دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کی اس کے نزدیک یہ صورت ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں ایک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کا براہ راست اثر اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس سے زندگی کی ساری قدریں از خود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ اسی طریق سے انسانیت کا ارتقاء ہو رہا ہے۔

مارکس کی نگاہ میں متضاد اجزائے تمدن اور اقدار اخلاق کے ٹکراؤ کا منظر تصادم اقوام نہیں بلکہ تصادم طبقات ہوتا ہے اور ہیگل کے برخلاف اس کے نزدیک اصل وحدت قوم نہیں طبقہ ہے قوم کا انحصار مصنوعی اور سطحی ہوتا ہے۔ چنانچہ اقوام کی باہمی جنگ اگر ہیگل کے نزدیک ارتقاء انسانی کے لئے ضروری ہے تو مارکس کے نزدیک طبقات کی باہمی کش مکش۔

(ج) ڈارون تیسرا مفکر جس نے اپنے طرز فکر سے معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو ایک زبردست قوت فراہم کی وہ ڈارون ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جانداروں کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے، ترقی کرنے اور شکل و صورت میں تغیر کرنے کا ایک

قدرتی رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن انواع حیوانات کا ارتقاء قدرت کے کسی تعمیری عمل کا رہین منت نہیں بلکہ تخریبی عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ حیوانات کی باہمی جنگ، قحط اور موت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

ڈارون کائنات کو ایک میدان کارزار کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس میں ہر آن ہر طرف زندگی اور بقا کے لئے طاقتور کمزوروں کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ لہذا جو جاندار اپنے دشمنوں سے بہتر جسمانی طاقتوں کا مالک ہے وہی زندہ رہتا ہے اور اصل میں وہی زندگی کی نعمت کا صحیح مستحق بھی ہے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ الغرض زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی صرف طاقتور کے وجود کو برداشت کرتے ہیں۔ کمزوروں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں اور نہ ہونی چاہیئے۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ کائنات کو اپنے ناتواں وجود سے جلد از جلد پاک کر دیں۔ اس طرح حالات کی مجبوری سے ارتقاء شروع ہوتا ہے اور یہ ایک مسلسل کش مکش کے ذریعہ بلند تر حیوانات پیدا کرتا ہے۔ انسان بھی جدوجہد کی انہی پر پیچ راہوں سے گزرتا ہوا انسانیت کی بلندی تک پہنچا ہے۔ جو کوئی بھی تنازع ارتقاء کی بھٹی میں سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے وہ صالح ہے اور کائنات اپنی آغوش صرف اسی کے لئے کھولتی ہے۔

معاشرتی ارتقاء کے بنیادی اصول اور ان کے نتائج

اب ان تینوں منکرین کے افکار کو جمع کرنے سے معاشرتی ارتقاء کا جو نظریہ وجود میں آتا ہے اس کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں۔

(۱) زندگی میں ارتقاء صرف کش مکش کی وجہ سے ہو رہا ہے (۲) اسی کش مکش کے نتیجے میں انسانیت ترقی کرتی ہے۔ (۳) اس کائنات میں جینے اور ترقی کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت کا مظاہرہ کرے۔ (۴) یہاں اصل مقصد کامیابی ہے خواہ کسی ذریعہ سے حاصل ہو۔

اس وقت ہمارے پیش نظر اس فلسفہ کی فکری لغزشوں کی نشاندہی نہیں بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ اس طرز فکر نے انسان کو انسان بنانے کی بجائے درندہ بنا دیا ہے اور دنیا کو جنت بنانے کی بجائے جہنم بنا ڈالا ہے

۱۔ اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا وہ یہ ہے کہ انسان کی مادی ترقی ہی انسانی زندگی کی معراج ٹھہری۔ چنانچہ انسانوں کے مختلف گروہ اور طبقات مادی اسباب کی فراہمی کے لئے دیوانہ وار جدوجہد کرنے

لگے اور اس سلسلے میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہ رہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو خود موت کو دعوت دیتے۔ اسی طرزِ فکر نے لوگوں کے اندر ایک مستقل خوفزدگی کی کیفیت پیدا کردی۔ فرد ہو یا قوم سب کے دل میں اسی خونخوار جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے اور سب لوگ ایک دوسرے سے لرزاں نظر آتے ہیں۔ اس مسلسل خوف نے انسانیت کے اندر نہایت ذلیل خصائص کو ابھار دیا ہے۔ مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بدعہدی، خیانت اور ریاکاری، عہدِ حاضر کے ماہرینِ نفسیات نے اپنے انکشافات سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ انسان کے وہ اعمال جن کی غایت اپنی قوت کا اظہار ہے ان کے پیچھے خوف کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ فوجی قوت کی بیجا نمائش، خسروانہ جدل اور غیر مسئول اقتدار کی ہوس سب اسی کا نتیجہ ہیں

۲۔ اس طرزِ خیال نے انسانیت کے مستقبل کو سراسر تاریک کردیا۔ جو فلسفہ انسانی انا کے عمل تخلیق کی توحید زمان و مکان کے ذریعہ کرے گا وہ انسان کو کائنات کے قواعد و حدود تو بتا سکتا ہے مگر اس کی زنجیروں سے انسان کو کبھی نجات نہیں دلا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں روز بروز مایوس ہوتا جاتا ہے۔

۳۔ چونکہ یہ نظریہ باہمی کش مکش کو انسانیت کے ارتقا کا سبب سمجھتا ہے اس لئے انسان میں تعاون کے احساسات ابھرنے کی بجائے مخاصمت اور حسد کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہ نظریہ انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر تمہیں پھولنا پھلنا ہے تو تمہیں اپنا سب کچھ اس کش مکش میں جھونک دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان بالکل بے رحم اور سنگدل بن گیا ہے۔ اس کی رو سے اگر کوئی قوی کسی کمزور کو پامال کرکے آگے بڑھتا ہے تو وہ عین فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ جینے کا حق صرف اسی کو ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ظلم سہتا ہے اور طاقتوروں کے پاؤں تلے پامال ہوتا ہے تو وہ اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اس نظریہ نے نہ صرف انسانیت کو جابر اور ظالم بنا دیا ہے بلکہ ہر صاحب قوت کو برحق ثابت کرکے سرمایہ داری اور استعماریت کے لئے عقلی زمین فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے شر سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ اس فلسفہ نے اسے سراسر خیر میں تبدیل کردیا ہے۔ پہلے لوگ ظلم کرنے والے کو ظالم سمجھتے تھے، اب اسے عادل سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف کہتا ہے

• انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے ۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے ۔آج کوئی ظالموں کی بہیمیت کو ختم کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور واقعہ یہ ہے کہ زندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے ۔"

۴: پھر اس تصور حیات نے لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو راسخ کر دیا ہے کہ ہر قسم کی حرکت اور کشمکش ،بشرطیکہ وہ مادی اعتبار سے کامیاب ہو، انسانی ارتقار کی ضامن ہے اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے حق اور انصاف کی بجائے قوت اور طاقت کی پرستش شروع کی ۔ اس نے اپنی ذہانت اور طباعی کو ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف کیا جن سے اس کی طاقت اور قوت میں اضافہ ہو ۔ جارحانہ ملوکیت اور ظالمانہ سامراج اسی تصور کے شاخسانے ہیں ۔

۵ ۔ نیز اس طرز فکر نے لوگوں کو مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کرنے کا درس دیا ۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کا فرض یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی بقا و استحکام اور حصول قوت و اقتدار کے لئے کوشاں رہیں ، چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو ۔ اگر یہ مقصد مذہب و اخلاق کی پیروی سے حاصل ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے ۔ اگر کامیابی ان کو ترک کر دینے سے حاصل ہوتی ہو تو انہیں فی الفور نظر انداز کر دینا چاہیئے ۔ پچھلی چار صدیوں میں میکیاولی کی تعلیم کو جو قبول عام نصیب ہوا اس کی بڑی وجہ یہی نظریہ ہے گوبلز کے مندرجہ ذیل الفاظ اس فکر کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں ۔

" ساری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مخالف کو شکست دی جائے ، ہماری تحریک مذہب کی پیش کردہ اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے "۔

یہ ہیں مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور ان کے انسانی زندگی پر اثرات خواہ یورپ کی لادینی جمہوریت ہو یا روس و چین کی اشتمالیت یا ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت یہ سب اسی ایک تہذیب کے مختلف رخ ہیں ۔ ان کی اساس اور بنیادی روح ایک ہی ہے اور یہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد کی مانند ہیں ۔

لادینیت اور اس کے اثرات کا جائزہ مندرجہ بالا صفحات میں آگیا ہے ۔ اب ہم آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ اشتمالیت کا مطالعہ کریں گے ۔

اشتمالیت

اشتمالیت سرمایہ دارانہ جمہوریت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے، اشتمالی ریاست کے قیام کا اصل مقصد یہی تھا کہ ان خرابیوں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے جو دورِ جدید کے معاشرہ کو لاحق ہیں اور اگرچہ اشتمالی علمبردار سرمایہ دارانہ تہذیب کی اقدار پر کڑی تنقید کرتے ہیں لیکن اشتمالیت کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "دین مادیت" کے خلاف ردِعمل نہیں بلکہ اس کی تکمیل ہے ان دونوں میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں کو ایک ہی سرچشمہ سے فکری غذا ملتی ہے۔ معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین اور علم و فلسفہ کی بنیادی قدریں دونوں میں مشترک ہیں۔ اگر ان میں کچھ فرق ہے تو صرف مظاہر کا ہے نوع کا نہیں۔ اشتمالیت مادیت ہی کی زیادہ موثر وسیع اور ہمہ گیر تحریک ہے۔ اس نے زندگی کے سارے شعبوں کو مادہ پرستی کی بنیادوں پر استوار کر کے نہ صرف انہیں ہم رنگ بلکہ ہم آہنگ بھی بنا دیا ہے لہذا اس کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ یہ محض غریبوں اور مفلسوں کے معاشی مسائل کا حل نہیں بلکہ فکر و نظر، فلسفہ و اخلاق تمدن و تہذیب اور مابعد الطبیعیاتی تخیلات کا ایک مستقل نظام ہے اور اس لحاظ سے کوئی شخص اس پورے نظام کو قبول کئے بغیر محض اشتمالی معاشیات کو اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کوئی ایسی ناممکن اور خلافِ عقل بات کا دعویٰ کرتا ہے تو یا تو وہ کم علم ہے یا منافقت سے کام لیتا ہے اس نظامِ فکر میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ آپ اس کی ایک چیز لے لیں اور باقی چیزوں کو چھوڑ دیں اس کے سارے پہلو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور اپنی بقاء کے لئے اپنے دوسرے اجزاء سے غذا حاصل کرتے ہیں

اشتمالی فلسفۂ حیات

اشتمالیت کے حامی اور اس کے مخالف عام طور پر اپنی بحث کا آغاز تاریخ کی مادی تعبیر سے کرتے ہیں، یہی ان کے نزدیک اشتمالی فلسفہ کی جان ہے مگر ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر اس نقطۂ نظر کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جو اشتمالیت اس کائنات کے متعلق انسان کو عطا کرتی ہے۔ انسان

خواہ کسی خیال کا حامی ہو، وہ اس امر پر غور کرنے کے لئے مجبور ہے کہ جس دنیا میں وہ زندگی گذار رہا ہے اس میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ وہ اگر اس کو برتتے تو کیا سمجھ کر برتتے؟ اس کی زندگی کا مقصود و منتہا کیا ہے؟ یہ وہ اولین اور بنیادی سوالات * ہیں جن کو کوئی ایسا نظام نظر انداز نہیں کر سکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو۔ انہی سوالات کے حل پر کسی نظام فکر کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مارکسی فکر کی اساس یہ ہے کہ اس کائنات کی اصل حقیقت مادہ ہے جو جواہر کے مجموعے سے عبارت ہے جن کی تشریح طبیعیات کے اصول موضوعہ کے ذریعہ ہی کی جا سکتی ہے۔ عالم میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ ان قوانین کا پابند ہے اس طرز خیال کے حامیوں کے نزدیک کسی بالاتر ہستی کا وجود یا اس کی فرمانروائی پر یقین نہ صرف خلاف عقل و فطرت ہے بلکہ انسانیت کے لئے نہایت خطرناک اور مہلک بھی ہے خدا خود کوئی قائم بالذات ہستی نہیں بلکہ اس کے وجود کا اقرار انسان کی عاجزی اور درماندگی کا اعتراف ہے نوع انسانی جب کائنات کے اسباب و اثرات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم کو جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے سمجھنے سے عاجز آجاتی ہے تو وہ مجبور ہو کر ایک بالاتر ذات کو تسلیم کر لیتی ہے مگر جب انسان طبیعی قوانین کی ان پیچیدگیوں کو حل کر لے گا تو پھر اس کے دل میں خود بخود کسی بلند و بالا ذات کا خوف باقی نہیں رہے گا۔ اس لحاظ سے خدا کا وجود دراصل قوانین طبیعی سے لاعلمی کا نتیجہ ہے

وہ فلسفہ جو انسان کو یہ تعلیم دے کہ اس دنیا میں کوئی بالاتر ہستی موجود نہیں وہ قدرتی طور پر ذہن انسانی میں اس خیال کو بھی راسخ کر دیتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت اس کارخانۂ حیات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے کی سی ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ ان کے ہاتھوں میں بے بس کھلونا بھی ہے۔

پھر جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس عالم کی ماہیت زمان و مکان کے علاوہ کچھ بھی نہیں تو ہمیں از خود اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مادہ کی یہ منظم دنیا صرف توانائی کی لہروں سے تعمیر کی گئی ہے اور اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا عالم نہیں۔

اس میکانیکی تصور حیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے عمل میں غیر ذمہ دار اور خود غرض ہو جاتا ہے معاشرتی زندگی میں بجائے تعاون کے مسابقت و مخالفت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور اس طرح معاشرہ میں چین و سکون کی بجائے فساد و اضطراب کا دور دورہ ہوتا ہے۔

ان ابتدائی گذارشات کے بعد اب ہم اشتمالی فلسفہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

---

* زندگی کے بنیادی سوالات پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو باب اول مرتب

تاریخ کی مادی تعبیر

مارکسی فکر کا پہلا عنصر تاریخ کی مادی تعبیر ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کے مطابق کسی عہد کا معاشی نظام ہی تاریخ کے اس عہد میں معاشرتی زندگی کی اصل بنیاد ہے، مذہب، تہذیب، فلسفہ حیات، فنون لطیفہ سب اسی کا عکس ہیں، یہی نہیں بلکہ تمام انسانی تخیلات و جذبات اسی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ فکر معاش کی تگ و تاز ہی فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، الغرض یہی معاشی نظام حیات انسانی کے سارے مشاہدات کی اصل خالق ہے۔ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ کے تقاضوں کے علاوہ بھی کچھ اور تقاضے ہیں۔ مگر وہ سب غلط فہمی کا شکار ہیں، انسانی زندگی کا اصل محرک صرف معاشی ضروریات ہیں۔ مارکس نے اسی طرز فکر کو اپنے فلسفہ تمدن اور تاریخ کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے کیونکہ اس کے نزدیک زندگی کی تمام قدریں اسی کے توسط سے تخلیق پاتی ہیں۔

معاشی نظام دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ایک پیداواری قوتیں اور دوسرے معاشی تعلقات۔ معاشی تعلقات بذات خود پیداواری قوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ رفتار زمانہ کے ساتھ جب طریق پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہم آہنگی باقی نہیں رہتی اور معاشرتی تعلقات کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وہ کوششیں ہیں جنہیں ہم تاریخ عالم میں انقلابات کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، چونکہ ایجادات و اکتشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ طریق پیدائش میں ہر آن تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے اس لئے انسانیت کو کبھی کسی منزل پر سکون و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ جب ایک منزل پر اس کا قافلہ پہنچ جاتا ہے تو پھر پیداوار کے طریقوں میں ایک تغیر رونما ہوتا ہے جو انسانیت کو پھر بے چین کر کے اسے آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس نظریہ سے نہ صرف انسانی ارتقار کی شاہراہ معلوم ہوتی ہے بلکہ اس سے اخلاقی اقدار کا ایک نیا تصور بھی سامنے آتا ہے، اس کے مطابق دنیا کی ساری صداقتیں اضافی قرار پاتی ہیں یہ حقیقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے، اسی دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانے کے لئے یکساں طور پر صحیح اور ابدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ لہٰذا ہر دور کے جداگانہ معتقدات ہوتے ہیں۔

نیک و بد، محمود و مذموم اور حق و باطل کی تفریق سراسر فریب ہے ایک چیز جو ایک دور میں حق ہے وہی دوسرے دور میں باطل ہو سکتی ہے اسی طرح ایک عمل ایک خاص ماحول میں نیکی تصور کیا جاتا ہے تو ماحول کے تبدیل ہونے کے ساتھ ہی اس کے متعلق ہمارا نظریہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انسانی تصورات و تخیلات اور اخلاقی اقدار خارجی احوال و واقعات اور خصوصاً معاشی نظام کا عکس ہوتے ہیں۔

جہاں تک اس نظریہ کی صحت کا تعلق ہے ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ معاشی تقاضے انسانی زندگی میں بڑا اہم مقام رکھتے ہیں، ہمیں اس امر میں اختلاف جو کچھ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ہر چیز ان تقاضوں کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں دوسرے عوامل بھی اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ حاشی انسان کو حیات مستعار کی چند گھڑیاں گزارنے کے لئے کھانے کی ضرورت ہے گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے لباس درکار ہے اور سر چھپانے کے لئے وہ مکان کا محتاج ہے مگر یہ ضروریات اور ان کی فراہمی کی مختلف تدابیر اس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کی تخلیق نہیں کرتیں ایک مصور تصویر بنانے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں نکالا جاسکتا کہ مصور کے مختلف رنگ ہی اس کے آرٹ کے اصل خالق ہیں۔

مارکس کے اس فلسفہ کے مطابق وہ معاشرے جو ایک ہی سا معاشی نظام رکھتے ہیں لازمی طور پر ایک ہی جیسا تمدن اور ایک ہی قسم کی اقدار رکھتے ہوں گے۔ مارکس نے تاریخ انسانی کو جن ادوار میں تقسیم کیا ہے اس کے مطابق رومی اور قرون اولی کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے یعنی دونوں اقوام میں غلامی کا رواج تھا۔ پیدائش دولت کے طریق بھی دونوں کے ہاں ایک جیسے تھے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق ان دونوں قوموں کے اخلاق کو ایک ہی سطح پر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن تاریخ کی شہادتیں اس کے برخلاف ہیں تاریخ کا ایک مبتدی بھی اس عظیم فرق کو بخوبی محسوس کرتا ہے جو ان دونوں قوموں کے تصورات

---

* مارکس کے اس استدلال میں ایک بڑا اہم منطقی مغالطہ کار فرما ہے اگر ہم یہ مان لیں کہ ابدی صداقت کا کوئی وجود نہیں اور یہ کہ زمانہ کی فکر اور اس کے تصورات و نظریات اس زمانہ کے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں تو پھر کیوں نہ یہ بھی سمجھا جائے کہ خود مارکس کا یہ فلسفہ بھی انیسویں صدی کے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہے۔ آخر اس فلسفہ کو تاریخ کا اٹل اور ابدی قانون کیسے مان لیا جائے! مارکس کی اپنی منطق کا اگر اسی کے افکار پر اطلاق کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فلسفہ خاص دور کی پیداوار تھا اور اس دور کے ختم ہونے پر وہ بھی باطل ہو گیا۔ فکر انسانی میں اس کی کوئی مستقل بنیاد موجود نہیں ہے۔

کے درمیان پایا جاتا ہے۔ رومیوں کا اپنے غلامان سے سلوک اس قدر سخت اور وحشت ناک تھا کہ اس کے تصور سے آج بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس اسلام نے اس مظلوم طبقہ کو ظلم و استبداد سے نجات دلائی، اسے حیوانات کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی اقوام ایسی گذری ہیں جن کا معاشی نظام ایک سا ہونے کے باوجود تمدن و اقدار ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اقوام و افراد کی زندگی کی تعمیر میں فیصلہ کن چیز معاشی قوت نہیں، بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کی سعی و طلب کے لئے وہ زندہ ہیں* خامی دراصل مارکس کے مادی فلسفہ میں ہے جو انسانی شعور و ارادہ کو کلی طور پر معاشی ذرائع پیداوار کا نتیجہ قرار دیتا ہے، انسانی ارادہ و عمل معاشی عوامل سے متاثر تو ہو سکتا ہے لیکن وہ کلی طور پر ان کا پیدا کردہ نہیں بلکہ انسانی ارادہ و عمل کا محرک انسان کی خودی یا انا ہے۔ جو قائم بالذات ہے۔

مارکس کا مادی فلسفہ ایک اور طرح سے بھی اس کے نظریہ تاریخ میں کجی پیدا کرتا ہے۔ اس کے مادی فلسفہ کی رو سے مادہ سے ماوراء کوئی ذات نہیں جو حرکت و تغیر کا سبب بنے مادہ کی ایک حرکت ہی دوسری حرکت کا سبب بنتی ہے گویا پانی کا ارتعاش ہے جس کا ہر دائرہ اپنے سے پہلے بننے والے دائرہ کا نتیجہ ہے چنانچہ اخلاق و قانون میں تبدیلی سیاسی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے، سیاسی نظام میں تبدیلی معاشی تعلقات میں تغیر کا سبب ہے اور معاشی تعلقات میں تغیر پیداواری قوتوں کے تغیر کی مرہون منت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پیداواری قوتوں میں تبدیلی کس بنا پر واقع ہوتی ہے؟ اور کیوں ایسا ہوتا ہے کہ کسی دور میں ذرائع پیداوار میں اضافہ اور تغیر ہوتا ہے اور کسی دور میں جمود و سکوت رہتا ہے؟ ذرائع پیداوار میں تغیر کا سبب مارکس "قوت تاریخ" کو قرار دیتا ہے لیکن اس "قوت تاریخ" کی حقیقت کیا ہے، مارکس اس کی کوئی توجیہ نہ کر سکا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی تصور مادی تصور کائنات سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ کہ مارکس نے اس قسم کا تصور پیش کر کے خود اپنے اساسی نظریات کی نفی کی ہے۔

---

* معاشی وسائل انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے درکار ہیں لیکن انسان انہی مقاصد کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے سوال یہ ہے کہ وہ چیز زیادہ موثر اور اہم ہے جس سے زندگی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں یا وہ جن کی خاطر انسان زندہ رہتا اور جان دیتا ہے۔

پھر مارکس کے اسی نظریہ تاریخ کی رو سے یہ بھی ضروری ہے کہ اخلاق و مذہب کی اقدار چونکہ معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لئے اخلاق مذہب کے بدلنے سے پہلے معاشی نظام کا بدلنا ضروری ہے لیکن تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ اخلاق مذہب کی تبدیلی کے بہت بعد ذرائع پیداوار اور معاشی تعلقات بدلے، خود مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ رسول اکرم کے صحابیوں میں اخلاق ومذہب کے اعتبار سے عظیم انقلاب واقع ہوچکا تھا۔ مدینہ میں ایک مکمل نظام سیاست وجود میں آچکا، کائنات وحیات کے بارے میں خیالات یکسر بدل چکے تھے، لیکن نظام معیشت جوں کا توں تھا۔ ان حقائق کی توجیہہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ انقلاب وتغیر کا اصل سبب شعور وارادہ ہے نہ کہ معاشی عوامل۔

طبقاتی نزاع

تاریخ کی مادی تعبیر سے ہی طبقاتی نزاع کے تصور کو اخذ کیا گیا ہے مارکس کے نزدیک ہر معاشی نظام جب ترقی کرکے ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہوکر اپنے زمانے کے حالات پیداوار سے متصادم ہوجاتی ہیں۔ نئی قوتیں اس بات کی متقاضی ہوتی ہیں کہ مروجہ نظام جس طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے اسے بدل کر طبقوں کی تقسیم ازسرنو عمل میں لائی جائے اور وہ ملکیتی نظام بھی بدل دیا جائے جو افراد معاشرہ کے ملکیتی تعلقات متعین کرتا ہے، یہ مطالبہ ایک جانب تو اس طبقہ پر سخت شاق گذرتا ہے جس نے نہایت عیاری سے مروجہ معاشی تنظیم اور طبقاتی تقسیم میں دوسرے طبقوں سے زیادہ قوت واقتدار حاصل کرلیا ہے اور دوسری جانب مظلوم طبقہ جب نئی پیداواری قوتوں کو آتے دیکھتا ہے تو ان کا نہایت ہی گرم جوشی سے استقبال کرتا ہے کیونکہ ان کا معاشی مفاد آنے والے نظام سے وابستہ ہوتا ہے اسی طرح غالب ومغلوب، ظالم ومظلوم میں ایک مسلسل کش مکش جاری رہتی ہے جسے عام طور پر طبقاتی نزاع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک ہر انقلاب اسی کشمکش کا نتیجہ تھا اور ہر اہم جنگ کے پس منظر میں یہی چیز کام کررہی تھی۔

مارکس کے اس نظریہ سے متعلق بھی ہمیں صرف اس قدر اتفاق ہے کہ بسا اوقات مظلوم

طبقے اپنے جائز حقوق کے حصول کے لئے ظالموں کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے مگر یہ کہنا یقیناً غلط ہے کہ ساری تاریخ محض اس نزاع و کش مکش کی داستان ہے یا یہ کہ انسانی معاشرے کے تمام انقلابات کا سبب صرف یہی طبقاتی تقسیم ہے۔ تاریخ کے اوراق سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قومی لڑائیوں کے اثرات طبقہ واری لڑائیوں سے زیادہ کثیر الوقوع، زیادہ تند و تیز، زیادہ خونریز اور انسانی مستقبل کے لئے زیادہ فیصلہ کن تھیں۔ خود ہمارے زمانے میں جبکہ دنیا کے سارے انسان مارکسیوں کے بقول دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں، جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقاتی شعور سے زیادہ موثر و طاقتور ثابت ہوئے ہیں۔ کیا جرمنی کا مزدور طبقہ روس کے پرولتاری بھائیوں کے خلاف صف آرا نہ ہوا؟ اور کیا انگلستان کے سرمایہ دار طبقہ نے جرمنی کے بورژوا طبقہ سے کوئی رعایت کی؟* پھر اسلام کا لایا ہوا ہمہ گیر انقلاب کس طبقاتی نزاع کا نتیجہ تھا؟ کیا مسلمانوں میں عثمان غنی اور بلال حبشی کا باہمی برتاؤ بھائیوں جیسا نہ تھا؟ کیا وہ اپنے ہی طبقے کے امراء اور غرباء سے اسلام کی سربلندی کی خاطر شانہ بشانہ نہیں لڑے؟ صحیح ہے کہ انقلاب فرانس میں کسی حد تک معاشی عامل کا ہاتھ تھا، یہ بھی درست ہے کہ یہ نزاع دو ایسے طبقات کے درمیان تھی جن میں سے ایک کا مفاد پرانی پیداواری قوتوں سے اور دوسرے کا نئے ذرائع پیداوار سے وابستہ تھا لیکن تاریخ کے تمام انقلابات اسی نوعیت کے نہیں۔ پھر انقلاب فرانس میں بھی معاشی عامل دوسرے بہت سے عوامل میں سے صرف ایک تھا اگرچہ اس کا اثر دوسروں کی نسبت زیادہ اگر طبقات کی تھا تقسیم ہی واحد سبب ہوتا تو انقلاب فرانس سے زیادہ شدید انقلاب فرانس سے قبل انگلستان میں آنا چاہئیے تھا۔ اس لئے کہ وہاں زیادہ تیز صنعتی ترقی کی بنا پر طبقات کی نئی تقسیم زیادہ واضح تھی لیکن انقلاب انگلستان کو اس کے پر امن اور غیر شدید ہونے کی بنا پر "شاندار انقلاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

---

* یہ ایک دلچسپ تاریخی واقعہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل اشتمالیوں کی عالمی تحریک "دوسری انٹرنیشنل" نے متفقہ طور پر یہ طے کیا تھا کہ جنگ کا موقع عالمی اشتمالی انقلاب کے لئے بے حد سازگار ہے اور اس موقع پر ہر ملک کے مزدور اور اشتمالی پارٹیاں اپنی حکومتوں کے خلاف بغاوت کریں لیکن ہوا یہ کہ اس کانفرنس سے واپس آکر روس کو چھوڑ کر باقی تمام ممالک کے اشتمالی قائدین نے اپنی حکومتوں کی تائید کی اور کچھ تو "وزیر جنگ" تک بن گئے۔ قومیت کا عنصر طبقاتی مفاد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ موثر رہا اور دوسری انٹرنیشنل قومیت کی اس چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی لینن نے بڑا سر پیٹا لیکن قومیت کی رو کے آگے اس کی کچھ نہ چل سکی۔

نظریہ قدر زائد

اشتمالیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہو۔ چنانچہ مارکس کے نزدیک اس شے کی قیمت کا واحد حق دار صرف مزدور ہے، وہ کہتا ہے کہ چونکہ اس دور میں مزدور کو قیمتی آلات پیدائش خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی اس لئے وہ مجبور ہے کہ صرف اس پر قناعت کرے جو صنعتکار اس کو بخش دے۔ ایک شے کی اصل قیمت مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جسے قدر زائد کہا جاتا ہے۔ حقیقتاً تو یہ مزدور کا حصہ ہے لیکن صنعت کار اسے "قانونی ڈاکہ زنی" کے ذریعہ ہڑپ کر جاتا ہے۔

ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے مارکس سے بڑھ کر اس بات کے حامی ہیں کہ مزدور کو اس کا پورا حق ملنا چاہیئے۔ رسول اکرمؐ کی حدیث ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔ اس حدیث کے جہاں یہ معنی ہیں کہ اجرت کی ادائیگی میں عجلت ضروری ہے وہاں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ اجرت ایسی ہو جو کام کی منصفانہ مزدوری کہلانے کی مستحق ہو۔ لیکن کوئی بھی سمجھ دار آدمی یہ ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ شے کی قیمت محض مزدور کی محنت کا نتیجہ ہے۔ کسی شے کی تیاری میں موجد کی ذہنی صلاحیت استعمال کی بنا پر مشین کی شکست و ریخت، صنعت کار کا حسن انتظام، کاریگر کی مہارت اور مزدور کی محنت سبھی کچھ شامل ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر پورا نفع مزدور ہی کو لوٹا دیا جائے چنانچہ جو چیز اصل اہمیت کی حامل ہے وہ ملکیت کا مزدور کو سونپا جانا نہیں بلکہ منافع کی منصفانہ تقسیم ہے۔

تصور ریاست

اشتمالیت کا چوتھا اصول ریاست سے متعلق ہے۔ اس کے مطابق ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جس کی غرض بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ دولت مندوں اور برسر اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی کرے ہر عمرانی ادارہ کی طرح ہر سیاسی ادارہ بھی اس کے نزدیک مروجہ نظام معیشت کا خارجی قالب ہوتا ہے جس کا مقصد انتظامیہ کی نگاہ میں بس یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ برسر اقتدار لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے اور ان کی منفعت اور غریب طبقہ کے استحصال کو قانونی شکل دے کر ان کے مفادات کو کھیلتی رہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر اوقات سرمایہ دار افراد اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر سیاسی قوت کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور بسا اوقات وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ہم خود کہہ چکے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ ریاست دولت مند طبقہ کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے لیکن کسی چیز کے غلط استعمال سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ شے بذات خود بری ہے۔ پھر تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں ایسی ریاستوں کا وجود بھی رہا ہے کہ جن کو سرمایہ دار طبقہ اپنے مفاد کے لئے باوجود کوشش کے استعمال نہ کر سکا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ریاست کا اصل مقصد تو عدل و میزان کا قیام ہے یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی خود غرضی کی بناء پر کبھی کبھی اسے ظلم و زیادتی کے لئے بھی استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی ریاست کا وجود برسراقتدار لوگوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے نہ تھا بلکہ اس کی غایت سماج کے مختلف طبقوں میں مساوات قائم کرنا تھی چنانچہ خلیفہ اول اپنی حکومت کا بنیادی مقصد بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اور تم میں جو بے اثر ہیں میرے نزدیک وہ با اثر ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں (انشاء اللہ) اور تم میں جو با اثر ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول نہ کر لوں (انشاء اللہ)

اشتمالیت کے ان بنیادی تصورات پر اشتمالی تحریک کی جو عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی اس کے تحت لوگوں کو بتایا گیا کہ دنیا کی ساری برکتیں اسی کو اپنانے سے حاصل ہو سکتی ہیں جو قوم بھی اسے قبول کرے گی اسے اس دنیا میں جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ خصوصاً۔

۱۔ اس کے اندر طبقاتی تقسیم ناپید ہو گی۔
۲۔ کوئی طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم نہ کر سکے گا۔
۳۔ مساوات شکم کے اصول پر کاربند ہونے سے معاشرتی عدل قائم ہو گا۔
۴۔ ریاست، جو جبر کا سب سے بڑا اوزار ہے خود بخود ختم ہو جائے گی۔

اشتمالیت جن ذرائع سے ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اس کے بنیادی اصول یہ ہیں۔

۱۔ دولت کی شخصی ملکیت کا استیصال کر دیا جائے۔

۲۔ دولت اور وسائل دولت آفرینی پر تمام حقوق مالکانہ جماعت کو حاصل ہوں۔
۳۔ دولت آفرینی اور تقسیم دولت کا پورا انتظام جماعت کے ہاتھ میں ہو جس کی طرف سے حکومت اس فریضہ کو سرانجام دے۔

اس مشترک ملکیت" کا حصول بہرحال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس ہنسی خوشی انجام پا جاتا۔ جہاں کہیں بھی اشتمالی برسر اقتدار آنے میں کامیاب ہوئے ہیں اول تو خود فریبی، دغا اور قتل و غارت گری کے بعد حصول حکومت میں کامیاب ہوئے پھر برسوں تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم و ستم کے بعد اجتماعی ملکیت کا نفاذ ہو سکا۔ صرف روس میں اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جس قدر ظلم و تشدد اور قتل و خون ہوا اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکے گا جو جان دین ہرڈ نے اپنے تیس سالہ قیام روس کے زمانہ میں فراہم کئے اور جو ڈیلی گزٹ کراچی کی اشاعت مورخہ ۵، ۶ جون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے۔

تعداد مقتولین

اساقیف	۳۱	امراء و روسا	۶۵۸۹۰
اہل خدمات کلیسا	۱۵۶۰	فوجی افسر	۵۶۳۴۰
جج، وکلا، مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵	مزدور	۱۹۶۰۰۰
اساتذہ و طلبا	۱۶۳۶۷	سپاہی اور ملاح	۳۶۰۰۰
سول حکام	۷۹۹۰۰	کسان	۸۹۰۰۰۰

ان اعداد و شمار پر ایک نگاہ ڈالئے اور دیکھئے، کیا یونانیوں کی ستم ریزیاں ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں اور چنگیز و ہلاکو کی قتل و غارت گری اس فہرست کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہے؟
پھر یہ سارا ظلم و تشدد بھی گوارا کر لیا جاتا اگر اس سے وہ نتائج برآمد ہوتے جن کی اشتمالیت دعویدار تھی۔ ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دینا اصل مقصود نہ تھا۔ بلکہ یہ اصل نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ایک ذریعہ تھا۔ اصل مقصد طبقاتی تقسیم کا خاتمہ تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ خود ایک فرانسیسی اشتمالی جوان کا بیان ہے۔

"روس کے اندر طبقہ واریت پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ یہاں امراء بھی ہیں غرباء بھی، غالب بھی مغلوب بھی۔ ان کے معیار زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ ریل کے ڈبوں جہازوں اور ریستورانوں میں مختلف درجوں کا پایا جانا طبقہ واریت کی کھلی اور روشن دلیل ہے۔

طبقہ واری تقسیم کا اندازہ تنخواہوں کے اس تفاوت سے بھی ہوتا ہے جو روس میں عام ہے جب کہ منتظمین اور ماہرین ۳۰۰۰۰ روبل ماہانہ پاتے ہیں تنخواہوں میں اتنا عظیم فرق دوسرے جمہوری ممالک میں بھی نہیں ہے۔

اشتمالیت کے موئدین بڑے شد و مد سے روس کی قومی آمدنی میں اضافہ کے اعداد و شمار گناتے ہیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ اس اضافہ میں کتنے بے گناہوں کا خون شامل ہے۔ روس کے اکثر بڑے منصوبے جبری محنت کا نتیجہ ہیں۔ مشہور عالم کتاب "میں نے آزادی کا انتخاب کیا" کا مصنف جو ایک سابق اشتمالی ہے اپنی تصنیف میں لکھتا ہے

ہماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سرکاری حلقوں کا بیان ہے کہ یہ تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ تھی"۔

یہ وہ لوگ تھے جن پر غدار وطن اور اشتمالیت دشمن ہونے کا شبہ تھا۔ چنانچہ ایسے افراد کو پکڑ کر سائبیریا بھیج دیا جاتا جہاں ان سے صبح چار بجے سے شام کے سات بجے تک کام لیا جاتا۔

پھر اگر ان بیانات کو ہم "روس کے خلاف سازش" قرار دے کر نظر انداز بھی کردیں تو قومی آمدنی میں اضافہ تو منصوبہ بند معیشت کے ذریعے کہیں بھی ممکن ہے اس لئے نہ اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے اور نہ جبر و تشدد کی۔ جاپان اور جرمنی نے ماضی قریب میں اشتمالی نہ ہونے کے باوجود اقتصادی طور پر جو ترقی کی وہ اس دعویٰ کا عملی ثبوت ہے۔

مغربی تہذیب کا مستقبل

اوپر ہم نے جن عناصر تہذیب کا مطالعہ کیا ہے ان کے متعلق یہ کہنا انصاف و دیانت کے بالکل خلاف ہوگا کہ ان میں حق اور خیر و افادیت کا سرے

سے کوئی پہلو ہی نہیں۔ نہیں ایسا نہیں' ہے۔ دنیا میں خالص باطل اور شر و مضرت کا ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہنا محال ہے۔ دنیا میں جب کبھی بھی سلبی اقدار پروان چڑھتی ہیں تو وہ اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے جلو میں چند ایجابی اقدار کو لے کر چلیں۔ اس کے بغیر ان کا قافلہ ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتا۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی حال اس تہذیب مادیت کا ہے۔ اس تمدن نے انسانیت کی بعض پہلوؤں سے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ انسانی عقل کو ایک زوال پذیر مذہب باطل کے لئے جس بندھنوں سے نجات دلائی۔ اسے سوچنے اور سمجھنے پر ابھارا۔ لوگوں کے دلوں پر سے جہالت اور لاعلمی کے پردوں کو چاک کر کے انہیں اکتساب علم اور اجتہاد فکر کے لئے تیار کیا اور اس طرح کلاسیکی سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر بنایا اور اس طرح قلب و نگاہ کی تبدیلی سے پوری زندگی کو متاثر کیا۔

مگر اسے انسانیت کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب اہل یورپ نے ایک بار عقل سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کیا تو اس کا سیلاب اس رخ پر بہہ نکلا جہاں انسانیت کو شدید قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ دنیا میں آج کل جس قدر فکری اور عملی بے راہ روی پائی جاتی ہے وہ سب عقل کی اسی بے لگامی کا نتیجہ ہے اور جب عقل انسانی خالص مادیت کے دھارے پر بہتے ہوئے بہت دور نکل آئی تو آج وہ خود یہ بات سوچنے پر مجبور ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ علم و فن کی ترقی کے باوجود اور مادی سر و سامان کی فراوانی کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو سکون اور خوشی حاصل نہیں ہے؟ زمین ہر سال اربوں ٹن غلہ اگلتی ہے۔ مگر اس کے باوجود نوع انسانی بھوک کا شکار ہے! بحر و بر اور شمس و قمر مسخر ہیں لیکن پھر بھی انسان کو اطمینان قلب حاصل نہیں؟ انسان قتل و غارت گری سے نجات چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر چند سال بعد خود اپنی بنائی ہوئی مشینوں کے استعمال سے اور خود اپنے ہی ہاتھوں کروڑوں ابنائے جنس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے؟ وہ عقل جو مادیت کی راہ پر کچھ عرصہ پہلے کشاں کشاں چلی جا رہی تھی آج یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہے کہ اسے جن منازل تک پہنچنے کی امید تھی وہ باوجود طویل سفر کے اب پہلے سے بھی زیادہ

دور نظر آتی ہیں۔ انسان آج بھی مظلوم ہے۔ آج بھی خوفزدہ ہے، معاشرتی عدل آج بھی مفقود ہے۔ آج بھی دھوکہ ہے۔ فریب ہے مستقل قتل و غارت گری ہے۔ لوٹ مار ہے۔ ظلم ہے، ناانصافی ہے اور بعض پہلوؤں سے پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے، ٹھیک ہے کہ آج کے انسان نے فطرت کی تسخیر کی بحر و بر پر قابو حاصل کیا، مقامات کی دوری کو کم کیا، ذرات کا جگر چیر کر ان کی توانائی کو استعمال کیا لیکن یہ سب باتیں بذات خود مقصود زندگی نہیں بلکہ امن و سکون اور طمانیت قلب کے حصول کا ذریعہ ہیں، چین اور آرام کا وسیلہ ہیں اور جب اس مقصد ہی کو پورا نہ کریں تو بیکار ہیں۔

مادی تہذیب کے پیدا کردہ خطرناک نتائج تو دیکھ کر خود اہل مغرب خوفزدہ ہیں۔ ہم یہاں صرف دو بڑے مفکرین کے چند اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ آپ کو ان کے اضطراب کا معمولی سا اندازہ ہو سکے۔ مشہور ماہر عمرانیات پروفیسر سارو کن اپنی معروف عالم کتاب "ہمارے زمانے کا بحران" میں لکھتے ہیں۔

"بدیہی شہادتوں کے پیش نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ ہماری تنظیم اور ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گذر رہے ہیں جسم کا کوئی حصہ، قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں۔

تاریخ انسانی کے عظیم المرتبت عالم پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی نے اپنے ایک مضمون "تاریخ جدید انسان کو متنبہ کر رہی ہے" میں بڑی صفائی اور تفصیل سے تہذیب جدید کی ناکامی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤں بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا کہ اس کا بنک اکاؤنٹ، اس کی معاشی اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔ تعطل بڑا خطرناک ہے وہ سوچتا ہے کہ بازی مارلینی چاہیئے لیکن اسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر بھروسہ نہیں کہ جن کے بل پر اس کی کامیابی ہو۔"

ظاہر ہے یہ عدم اعتمادی ان پے در پے شکستوں کا نتیجہ ہے جو اسے ناقص ہنر کی بنا پر ماضی میں سہنا پڑیں "پوری تاریخ سے مجھے ایک ہی سبق ملتا ہے، یہاں کوئی چیز دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر ناکام نہیں اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرا اس بات پر پختہ یقین ہو گیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسر عمل رہتی ہے، ہماری سائنسی ترقیات صنعتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب تھیں، اور ایک نہایت ہی عمدہ جواب لیکن جو مسائل ہمیں درپیش

ہیں وہ اس نوعیت کے نہیں کہ ان کا جواب تجربہ گاہوں سے دیا جائے۔ یہ اخلاقی مسائل ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرہ میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔ اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی ہماری حالیہ مساعی بداہتہً ناکام ہو چکی ہیں اور ہمارے تمام بلند بانگ دعوے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔" چنانچہ وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ۔

"دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبیعی ایمان کا احیار ہے۔"

تہذیب الحاد کے بارے میں جو چند آرار پیش کی گئی ہیں وہ مغربی ادب کی سلوٹوں سے ڈھونڈ کر نہیں لائی گئیں بلکہ یہ وہ عام رجحان ہے جو یورپ میں بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے، آپ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں اسی کا تذکرہ پائیں گے، کسی رسالہ کے اوراق الٹیں اس میں یہی خیال جگمگاتا نظر آئے گا۔ یہ ٹھیک وہ لمحہ ہے جس میں انسان مذہب کی ضرورت کو نہایت شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

لیکن آج کے سائنٹفک انسان کے لئے صرف وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جو عقل و خرد کے خلاف نہ ہو، جو توہم و تعصب کا نتیجہ نہ ہو، جو غیر فطری عبادات و اعمال کا طلب گار نہ ہو۔ ان معیارات پر پرکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ حاضر کی ضرورتوں کو عین خوبی سے پورا کر سکتا ہے، ہندو مت اور بدھ مت کے خیالی فلسفے انسان کو محسور تو کر لیتے ہیں لیکن اس کی عملی زندگی میں رہنما نہیں بن سکتے۔ یہ مذاہب اصلاح باطن سے آگے نہیں بڑھتے، انہوں نے اخلاقی مواعظ و نصائح کا مجموعہ تو بڑا دلاویز پیش کیا ہے، مگر سیاست و معیشت کا کوئی خارجی نظام نہیں دیا جو ان مواعظ و نصائح کی پابندی کے لئے فضا سازگار کر سکے۔ عیسائیت نے تو خود مذہب و سیاست کی تفریق کو قبول کر لیا۔ لہٰذا موجودہ انسان کی بیماریاں دور ہو سکتی ہے تو صرف اسلام سے اور انسانیت کی فوز و فلاح اگر ممکن ہے تو اسلامی نظام زندگی کو بحیثیت

★ تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو باب ۳ "مذاہب عالم ایک تقابلی مطالعہ"

کل اپنانے سے۔ اسلام درحقیقت وقت کی پکار ہے۔ حالات کا مطالبہ ہے۔ زمانہ کا تقاضہ ہے۔ پریشان انسانیت کا مداوا ہے۔ حقیقی شادمانی کی ضمانت ہے۔

اب یہ فرض مسلمان کا ہے کہ وہ اس پکار پر سب سے پہلے لبیک کہے، خود اپنی زندگی کو اسلامی سانچہ میں ڈھال کر دوسروں کے سامنے مثال پیش کرے اور اس طرح دنیا کی امامت کا منصب حاصل کرے۔ کائنات کی ساری قوتیں اس کے اس نیک عمل میں تعاون کے لئے تیار ہیں اور خود یہ دعوت دے رہی ہیں۔

اُٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

حصّہ سوم

اِسلامی نظامِ حیات

فہرست

شریعتِ اسلامی کے ماخذ

اسلامی نظام زندگی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ معلوم کریں کہ اسلامی شریعت کے ماخذ کیا ہیں؟ اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے وہ محض انسانی عقل اور تجربہ کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا بلکہ ابتدائی اور اولین رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے اور ان کی روشنی میں عقل اور تجربہ کی مدد سے زندگی کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظام زندگی کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ ہدایت ربانی پر مبنی ہے اس لئے نظام زندگی کے مختلف شعبوں اور ان میں اسلام کے مخصوص مزاج کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے، اصلاح کے لئے اسلام کے طریق کار کا مطالعہ کر لیا جائے اور قدرے تفصیل سے یہ دیکھ لیا جائے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کر رہے ہیں وہ کتنے قابل اعتماد ہیں۔ مندرجہ ذیل صفحات میں یہی بحث کی گئی ہے۔

شریعت: معنی و مفہوم

شریعت (شرعۃ اور شرع) کے لغوی معنی "کھلے ہوئے، روشن، سیدھے اور صاف راستہ" کے ہیں۔ لیکن مذہبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ قوانین و احکام

ہیں جبکہ رسول اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اسکی بندگی اور فرمانبرداری کے لیے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔
لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجا ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت
(الاعراف ۶۱۲) اور ایک راہ عمل مقرر کی"

یعنی تمام انبیاء اور تمام کتب الٰہیہ سابقہ کا دین تو یہی اسلام تھا، لیکن شریعت، یعنی عبادت کے طریقے معاشرت کے اصول، باہمی معاملات اور تعلقات کے قوانین حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود وغیرہ امور سے متعلق تفصیلات کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اختلاف رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے پاس مختلف شریعتیں بھیجی تھیں اور جب تک دنیا نے تمدن اور اجتماعی زندگی کے وہ سارے وسائل پیدا نہیں کر لئے کہ ساری دنیا کو ایک رسول اور ایک شریعت پر جمع کیا جا سکے اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں میں رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا جو اپنی اپنی قوم کو الگ الگ شائستگی اور تہذیب و اخلاق کی تعلیم و تربیت دیتے رہے اسی لئے ہم دیکھتے ہیں - کہ بسا اوقات ایک ہی زمانے میں ایک سے زائد انبیاء مختلف خطہ ارضی میں دعوت حق کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں - اور جب ان انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور بیدار ہو گیا اور انسانیت کے اجتماع و تمدن کے مادی وسائل اتنے ترقی کر چکے کہ اب ساری دنیا کے لیے ایک ہی رسول و نبی کی بعثت کا وقت آپہنچا تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء (صلعم) کو مبعوث فرمایا، اور آپ کے ذریعہ ساری انسانیت کو وہ مکمل نظام زندگی عطا فرمایا جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات کے مطابق ہے اور اب اسی پر عمل پیرا ہو کر خدا کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس طرح اب دین تو وہی ہے جس کی طرف سلسلہ رسالت کی پہلی کڑی سے ہی انسانوں کو بلایا گیا۔ لیکن پرانی شریعتیں منسوخ کر دی گئیں - اور ان کی جگہ ایسی جگہ ایسی شریعت قائم کی گئی جس میں رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین اور حلال و حرام کے حدود یکساں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الہی قانون ہے جو نبی کریم (صلعم) کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا ہے اور اسی لئے شریعت کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

القانون الالھی الثابت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتقویم العقائد والاعمال وتھذیب الاخلاق وتدبیر المنزل وسیاست المدن	(یعنی، عقیدوں اور اعمال کی درستگی اور اخلاق کو مہذب بنانے اور خاندانی زندگی کی بہتری اور ملکی سیاست کی استواری کے لئے وہ الہی قانون جو نبی سے ثابت ہو۔

شریعت کا مقصد اور اسکی ہمہ گیری

"اسلام" تسلیم واطاعت کا دوسرا نام ہے اور جو لوگ "تسلیم واطاعت" کا یہ فعل کرتے ہیں اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ "مسلم" کہلاتے ہیں یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے اور اس بات کو انھوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے اجتماع سے "مسلم سوسائٹی" کی تشکیل وتنظیم ہوتی ہے یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجے میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے اور اس کی تنظیم ایسے معاہدے کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اس کی ہدایت ان کے لیے دستور زندگی ہے۔ اس کے احکام ان کے لیے قانون ہیں وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائے گا اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح وغلط اور جائز وناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے۔ اور اپنی آزادی کو ان حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے لیے کھینچ دے گا مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں کیا ہونا چاہیئے "

کا جواب خود تجویز نہیں کرے گی بلکہ اس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔ اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو خدا کی طرف سے "الکتاب" اور "الرسول" اسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی کو اس نظام اور اس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔

جس زمانے میں جس رسول کی جو شریعت تھی اس کا اصل مقصود معروفات کا پروان چڑھانا اور منکرات کا استیصال تھا، اور شریعت محمدیہ کا مقصود بھی انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو بھلی لگتی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا ہے دوسرے الفاظ میں "معروف" فطرت انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے جو خالق فطرت ہی کی طرف سے اس کی تابناکی کے لیے تجویز کردہ ہے اور "منکر" اس کے خلاف ہے۔

"شریعت" ہمارے لیے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برائی قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ ان بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف (بھلائیوں) پر قائم ہوں۔ اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں اور منکرات کو اسکی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیئے جائیں۔ اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سد راہ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائل قیام و ترقی بھی معروف شمار ہو جاتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ

بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشو ونما کا ذریعہ ہیں۔ معاشرہ کے پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی صورت میں قائم ہو۔ زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اس کا ظہور ہو۔ ہر طرف سے اس کو قائم ہوتے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے۔ اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے۔ اس کی پیدائش اور نشو ونما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر وہ زندگی میں گھس سکتا ہے، اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے

(۱) واجب یا فرض: یعنی وہ معروفات جو مسلم معاشرہ پر لازم کئے گئے ہیں ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مندوب یعنی مطلوب: یعنی وہ معروفات جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ معاشرہ میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے بعض کے قیام ونشو ونما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) مباح: شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو یا جن کے معاملے میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو۔۔۔ بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر، دنیا میں سب کچھ مباح ٹھہرتا ہے۔ یہی مباحات کا وہ دائرہ ہے جس میں شریعت

نے ہمکو آزادی عمل دی ہے۔ اور اسی دائرہ میں ہمکو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریقہ کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) حرام یعنی جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی
قطعی ممنوع: زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیئے گئے ہیں۔

(۲) **مکروہ:** یعنی اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحتاً یا کنایتہً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی درجہ میں ناپسندیدہ ہے بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں۔ اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ معاشرہ خود یا اس کے صالح عناصر سدباب کریں۔

معروف و منکر کے یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق و عادات، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ کونسی بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا، اور نشو و نما دینا ہے اور وہ کونسی برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے۔

کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہئے اور عملاً ہمیں کونسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

یہ پورا نقشہ زندگی ایک ہی نقشہ زندگی ہے اور اسکا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہوکر قائم نہیں رہ سکتا۔

شریعت اسلامی کے مآخذ

٭٭ شریعت کی اصطلاحی تعریف اوپر گزر چکی ہے جس سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ صاحب شریعت رسول ہوتا ہے نہ کہ کوئی امام یا مجتہد۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصطلاحاً شریعت موسوی اور شریعت محمدی وغیرہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن شریعت حنفی اور شریعت مالکی وغیرہ نہیں کہہ سکتے البتہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی وغیرہ کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں، کیونکہ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ

حکمة شرعیة فرعیة عملیة — وہ علم جسکا تعلق ایسے امور سے ہو جو عملی ہوں، فروعی ہوں، اور شریعت کی طرف منسوب اور اسی سے ماخوذ ہوں

جیسا کہ اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ:

علم بقواعد تیوسل بها الی کیفیة — ان قواعد ضوابط کا علم جو ذریعہ وسیلہ بنتے ہیں اس بات کے معلوم کرنے کے کہ مسائل کو ان کے

استنباط المسائل عن دلائلها التفصیلیة — تفصیلی دلائل سے کسطرح استنباط کیا جانا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اور فقہ (اور اصول فقہ) خالص اصطلاحی حیثیت سے مترادف نہیں ہیں شریعت اور فقہ کے درمیان فرق ان کی تعریفوں کے الفاظ پر ذرا گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے، کیونکہ فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے امر و حکم پر مبنی ہوتے ہیں اور شریعت سے ماخوذ و مستنبط ہوتے ہیں (شرعیة) دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرہ بحث میں صرف وہ امور آتے ہیں جو فروعی ہوتے ہیں (فرعیة) اور جو صرف عملی ہوتے ہیں (عملیة) اور شریعت کی مذکور الصدر اصطلاحی تعریف میں "عقائد و اعمال" دونوں داخل ہیں۔

یہ تو ہے شریعت اور فقہ کا بالتقابل استعمال، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ "فقہ" اور "شریعت" کا استعمال بجائے تقابلی حیثیت کے مجازاً بالانفراد کردیتے ہیں۔

یعنی عوام استعمال کی رو سے فقہ اور شریعت کو مرادف خیال کیا جاتا ہے اس بنا پر جب "شریعت اسلامیہ کے ماخذ" کا فقرہ بولا جاتا ہے تو اس وقت لفظ "شریعت" مذکور الصدر علمی اصطلاح میں نہیں بلکہ "بالانفراد" یعنی عوامی استعمال کی حیثیت سے بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب دراصل "فقہ اسلامی کے ماخذ" ہوتا ہے۔

ماخذ اول: الکتاب

شریعت یعنی اسلامی قانون کا پہلا ماخذ سب سے پہلی دلیل، سرچشمۂ اول اور ماخذ اساسی "الکتاب" یعنی قرآن کریم ہے جو خدا کا کلام ہے۔

تنزیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین (یہ کتاب یقیناً خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ (السجدۃ -۲)

کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ۔ (ص - ۲۹) (یہ) کتاب ہے جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں۔

تنزیلاً ممن خلق الارض والسموات العلیٰ (طٰہٰ - ۴) (یہ کتاب، زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی نازل کردہ ہے۔

اور یہ اسلامی شریعت و قانون کا اصل الاصول ہے اس میں شریعت کی بنیادیں بیان کی گئی ہیں عقائد کے باب میں اسکے اندر پوری تفصیل و وضاحت ہے اور عبادات و حقوق کا بیان اجمالی ہے۔
اسلامی شریعت میں اس قرآن کی وہی حیثیت ہے جو ملکی قوانین میں دستور کی ہوتی ہے۔ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد سارے مسلمانوں کے لئے پیشوا ہے۔

قل انما اتبع ما یوحیٰ الیّ من ربی ھذا بصائر من ربکم وھدیً ورحمۃ لقوم یؤمنون (الاعراف ۲۰۳) (اے نبی) آپ کہہ دیں کہ میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کیا گیا ہے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سوجھ بوجھ کی باتیں ہیں۔ اور (اس میں) ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

وانہ لذکر لک ولقومک (الزخرف - ۴۴) اور بے شک یہ (قرآن - الکتاب) تیرے اور تیری قوم کے لئے نصیحت ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (النساء - ۱۰۵)

بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جسطرح اللہ آپ کو دکھلائے۔

اس لیے یہ قانون شرعی کا اصل سرچشمہ ہے

ولقد جئناھم بکتاب فصلناہ علی علم ھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون (الاعراف - ۵۲)

اور بیشک ہم انکے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں۔ جسکو ہم نے علم کیساتھ ایماندار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت بناکر بھیجا ہے اور مفصل بیان کیا ہے۔

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ (النحل - ۶۴)

اور ہم نے تم پر یہ کتاب محض اسی لیے اتاری ہے کہ تم انکے سامنے وہ اصل حقیقت کھولدو جس میں وہ اختلافات کر رہے ہیں۔

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم - (الاسراء - ۹)

بیشک یہ قرآن اس راہ کی ہدایت کرتا ہے اور لگاتا ہے جو بہت ہی سیدھی ہے۔

اس قرآن کی وہی خصوصیت وصفت ہے جو ایک دستور کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ اسمیں مخصوص احکام کا بیان مجملاً ہے جزئیات وتفاصیل سے اس میں بہت ہی کم بحث کی گئی ہے اس لئے کہ اسمیں تفصیلات ہوتیں تو طوالت کیوجہ سے اس کی وہ حیثیت باقی نہ رہتی جو اس کی غرض وغایت ہے۔

غرض عام طور پر اس میں اجمالاً امر وحکم ہے کیونکہ جیسا کہا گیا، قرآن جزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے اسکا اصل کام یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے لیکن وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بتاتا بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حدود اربعہ بنا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑا کر دیتا ہے جو اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل وتعمیر کن خطوط پر ہونی چاہئے ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ انہیں مامور ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ دنیا کو اس انفرادی سیرت وکردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھادیں، جو قرآن کے دئے ہوئے اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔

قرآن: موضوعات، مقصد اور انداز تخاطب عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے اسی بنا پر جب کوئی شخص پہلی مرتبہ قرآن کا مطالعہ اس توقع کے ساتھ کرتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل مضمون کو ابواب اور حصص میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ پر بحث کی جائیگی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبہ کو لیکر اس کے متعلق بھی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی تو یہاں اسے اپنی توقع کے برخلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار کائنات کی طرف اشارے بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آجاتا ہے مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ کا، بعد الطبیعات ہے تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں، انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے۔ تو تعلیم طبیعیات کے طریقہ پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو علوم عمرانی کے طرز پر نہیں، قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو مقنّنوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، چنانچہ یہ کتاب فی الحقیقت تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے اس کی ترتیب دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے۔ اپنے موضوع اور مضمون و ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ ایک نرالی چیز ہے۔

مدعا، مرکزی مضمون اور قرآن کے موضوع کو معلوم کرنے کے لیے اس کی اصل کی طرف توجہ ضروری ہے۔ + اس ترتیب کا سبب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب انسان کا شعور کلی ہے۔ اور کوئی شعبہ نہیں ہے۔ وہ بیک وقت وجدان و عقل پر

اثر انداز ہوتا ہے معمولی مصنف اپنے خیالات کو کسی منطقی تقسیم کے ساتھ پیش کرتا ہے تو ابواب قائم کرتا ہے وجدان و کیفیات کا ذکر ہوتا ہے تو انداز بیان دوسرا ہوتا ہے اور اس میں منطق کو دخل کم ہوتا ہے اور ترتیب بھی دوسری ہوتی ہے، افسانہ یا تاریخ لکھتا ہے تو اسمیں واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتا ہے غرض کتاب کی ترتیب کا تعلق نفس مضمون سے ہے اخلاق کی کتاب میں ابواب داخل کیے جا سکتے ہیں لیکن جو کتاب بیک وقت انسان کی جملہ شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ کبھی ایسی تقسیم کو مقید نہیں پا سکتی۔ اس لیے قرآن کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف ہے قاری کو قرأت کے وقت قلب و دماغ، ہوش و وجدان سب کو بیک وقت حاضر رکھنا چاہیئے ورنہ وہ پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اس کے وہی اصل قبول کرنی ہو گی جو خود اس کے پیش کرنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔

مختصراً، اللہ تعالیٰ نے عقلی و ارادی قوتوں سے مالا مال کر کے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے کہ وہ خدا ہی کو اپنا حاکم و آقا تسلیم کرے اور اسکے عطا کردہ اختیارات سے سرمو تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی زندگی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلہ میں کامیاب ہونا ہے اسکے برعکس ہر رویہ غلط اور مختلف ہو گا جسے اختیار کرنے کے لیے انسان آزاد ہے پھر اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جو ہمیشہ رہے گی اور وہاں ابدی راحت یا ابدی رنج و مصیبت کے علاوہ کچھ نہ ملیگا جسکا مدار اس بات پر ہے کہ انسان دنیا میں کونسا رویہ اختیار کرتا ہے پھر انسانی فلاح و بہبود اور اسکی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ جن کا کام یہ تھا کہ صحیح رویہ کیطرف انسان کو دعوت دیں جس ہدایت کو انسان نے گم کر دیا ہے یا مسخ کر دیا ہے اسے پھر اصلی صورت میں پیش کریں۔ پیغمبر ہزارہا برس تک دنیا میں آتے رہے اور وہی ایک دعوت اور ایک ہدایت پیش کرتے رہے آخر کار اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے عام انسان اور پچھلے انبیاء کی بگڑتی ہوئی امتیں سب انکے مخاطب تھے سب کو صحیح رویہ کی دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں۔ انہیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا۔ جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف اصلاح دنیا کی جدوجہد کرے

بس اسی دعوت اور اسی ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے بلے اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ نہ یہ گم ہو سکتی ہے اور نہ مسخ کی جا سکتی ہے۔

اس اصل کی وضاحت کے بعد آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن کا موضوع "انسان" ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اسکا خسران کس چیز میں ہے۔ نیز اسکا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب انسان نے خدا اور نظام کائنات اور اپنی ہستی اور حیات دنیوی کے مال و انجام وغیرہ کے متعلق جو نظریات قائم کئے ہیں اور ان کی بناء پر جو رویے اختیار کئے ہیں وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجہ کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جس کی تعلیم اللہ کے برگزیدہ رسول نے دی ہے اور جسے "صراط مستقیم" کہا جاتا ہے۔

ان تین بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا۔ کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے اول سے آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون سے مربوط ہیں خواہ وہ زمین و آسمان کی ساخت، انسان کی خلقت، آثار کائنات کے مشاہدات پیش کرے خواہ گزری ہوئی قوموں کے واقعات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، ما بعد الطبیعی امور و سائل کی تشریح اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر کرے، وہ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کیطرف رجوع کرتا ہے۔

پھر قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یک وقت اسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو، نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے۔ کہ اس میں تجریدی طریقہ پر موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کیلئے منتخب کیا۔ اس کام کے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں۔ اور وہ زیادہ تر تین مضامین پر مشتمل تھیں۔ ایک پیغمبر کو خود اس عظیم الشان کام کی

۱

تیاری کے لیے تعلیم، دوسرے حقیقی نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں غلط فہمیوں کی مجمل تردید، تیسرے صحیح رویہ، کیطرف دعوت اور ہدایت الہٰی کے بنیادی اصول اخلاق کا بیان ہے شروع شروع کے یہ پیغامات بہت چھوٹے چھوٹے بولوں پر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت شستہ، شیریں، پر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے تھی تاکہ دلوں میں یہ تیر کی طرح پیوست ہو جائیں پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پرجوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کیے جن میں ندیا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی ان خطبوں میں ایکطرف اہل ایمان کو انکے فرائض بتائے گئے انکے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا۔ انہیں تقویٰ، فضیلت اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی انکو دین حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے کامیابی کے وعدے کئے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہ خدا میں جد و جہد کرنے پر ابھارا گیا دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو پچھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے پھر ہجرت کے بعد سے تو حالات کا نقشہ بدل گیا تھا امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ پچھلے انبیاء کی امتوں سے سابقہ پیش آیا، پرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے جنگ کی نوبت آئی خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے اور کئی سال کی شدید کشمکش سے گزر کر آخر کار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اسکے زیر نگیں ہو گیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے اس مرحلے اور ان ادوار کی بھی مخصوص ضرورتوں کیمطابق اللہ تعالیٰ کیطرف سے ایسے پیغامات آتے جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا اس میں نبی کو ریاست و مدینت صالحہ کی تعمیر، زندگی کے مختلف شعبوں کے اصول و ضوابط، کفار، منافقین، اہل کتاب سے سلوک، مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تفصیلی ہدایت دی گئی غرض ایکطرف عالمگیر دعوت و اصلاح کی اور دوسری طرف جماعت مسلمین کے سرداری کی اور تیسری طرف رئیس حکومت کی مختلف حیثیتوں کا تعین کیا گیا۔

غرض قرآن کے اسی طرح دعوت و اصلاح کے ادوار کی ضروریات کیمطابق مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تئیس سال کی مدت میں کامل ہوا۔

۔یہ قرآن انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ ایک وقت پر خاکہ بنا کر مضامین کو ترتیب کر دیا جاتا۔ اس میں حیات کا کلی تصور ہے جس کے مختلف گوشوں کو ایسے انداز میں روشن کیا گیا ہے کہ ان گوشوں کا حیات کی وحدانیت سے تعلق قائم رہے۔

۱۔ تدوین، جمع و ترتیب اور حفاظت:

یہ بات صرف قرآن سے ہی مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، من وعن بغیر کسی تبدل و تغیر اور تحریف و تقسیم یا ترمیم و تنسیخ کے بالکل اصلی اور محفوظ حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں اب تو اپنی شکل وصورت اور اصلیت بالکل کھو چکی ہیں۔ پھر چونکہ قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابوں کے برعکس اس کتاب (قرآن) کی حفاظت کی ضمانت خود اس کے نازل کرنے والے نے لی ہے تو پھر اس میں ادنیٰ تغیر وتبدل اور سر مو تفاوت کی بھی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

لایاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه (حم السجدۃ۔ ۴۲)	قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے۔
ان علینا جمعه (القیامۃ)	قطعاً ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔
انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (الحجر۔ ۹)	ہم نے اس الذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنے والے ہیں۔
بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ (البروج ۔ ۲۲)	بلکہ وہ تو بلند و بالا برتر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔

اور قرآن کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس کی حفاظت، جمع و ترتیب اور کتابت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ ہی جاری ہوا اور آخری مرحلہ تک جاری رہا۔ جب کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں ابتداءً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور قصوں کی

شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں۔ لیکن قرآن اول تا آخر مکتوب نظر آتا ہے۔
اس سلسلے میں سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ (البقرۃ) کی پہلی آیت میں اولین شہادت ہے
ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ — یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے۔
پیش کرنیوالا اس کو ابتداہی میں نوشتہ اور مکتوبہ (کتاب) شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی ایک مقام پر استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآن کی ہر بڑی سورت میں کتاب یا نوشتہ ہونے کا مسلسل ذکر ملتا چلا جاتے گا۔

لا یمسہ الا المطہرون — اس (قرآن) کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔
(الواقعۃ - ۷۹)

کا فقرہ بھی اس بات پر کافی دلیل ہے کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے چھوجانے کا بھی امکان تھا ورنہ محافظت یقیناً بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

پھر اس کی کتابت وحفاظت کا اہتمام دیکھئے کہ دوشنبہ ربیع الاول سنہ ۴ نبوی کو دوسری وحی اور تبلیغ کا حکم ہوا۔ پنج شنبہ کو خالد بن سعید مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان سے حضور صلعم نے کتابت شروع کرائی۔ ان کی دختر ام خالد بنت سعد نے بیان کیا ہے سب سے پہلے بسم اللہ میرے باپ نے لکھی اس طرح نزول وحی سے چوتھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول قرآن کے اختتام تک برابر جاری رہی۔ اور ایک دو نہیں بہت سے اصحاب سے کتابت وحی کا کام لیا جاتا تھا بلکہ مورخین کے ان کی تعداد ۴۲ تک بتاتی ہے (کتابہ اثنان واربعون) اور کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اسکو انجام دے دے۔ حتیٰ کہ ایک صحابی حنظلہ بن ربیع رض تمام کاتبوں کے خلیفہ اور نائب تھے اور انکو حکم یہ تھا کہ کوئی ہے یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس انتظام کا نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قلم بند ہوجاتی تھی۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے ہیں۔ مزید احتیاط یہ تھی۔ کہ

صرف لکھوانے پر ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قناعت نہ فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے۔ اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو آپ صلعم درست کراتے۔ جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دے دیا جاتا تھا پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ میں "جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی حضور مجھ کو بلاتے تھے۔ میں تختی و دوات قلم لیکر حاضر ہوتا۔ آپ لکھاتے، لکھا کر پھر سنتے اگر غلطی ہو جاتی تو صحیح کرا دیتے" پھر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قرآن کی کتابت کے لیے بغایت احتیاط بہترین چیزوں کا انتخاب کیا گیا تھا جن میں رقاع ۱، لخاف ۲، کتف ۳، عسیب ۴، ادیم ۵، اقتاب ۶، وغیرہ عام طور پر مستعمل تھیں تاکہ ایک طویل مدت تک آفات وحوادث سے حفاظت رہے۔

بہرغرض، اس حزم و احتیاط، اور انتظام و انصرام کے ساتھ قرآن کریم اپنی پوری مدت نزول میں بصورت تحریر جمع ہوتا رہا اور آیات و سور کی جمع و ترتیب کی تکمیل بحکم خداوندی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور پورا قرآن موجودہ ترتیب آیات و سور کے ساتھ حضور صلعم کے زیر ہدایت و نگرانی قید تحریر میں آ گیا چنانچہ تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ آج تک اسی نبوی جمع و ترتیب کے مطابق ایک نقطہ اور ایک شوشہ کی بھی کمی بیشی کے بغیر قرآن محفوظ و موجود ہے جیسا کہ مولانا بحر العلوم شرح مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں کہ

"قرآن کی یہ ترتیب جس پر دہ آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے"

اور مشہور شیعی فاضل علامہ سید محمد اپنی کتاب "تنزیہ الفرقان" میں مشہور شیعہ مجتہد علم الہدیٰ علامہ سید مرتضیٰ سے ناقل ہیں کہ

"قرآن جس ترتیب پر آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا اور اسی طرح مرتب تھا، اور اسی طرح سے اُس وقت پڑھا جاتا۔

۱۔ چمڑا (چرمی قطعات) ۲۔ پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں ۳۔ اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی (طشتری کی طرح) ۴۔ کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ اور عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے۔ ۵۔ باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا اور عرب میں گوشت خور ملک ہونے کی وجہ سے انکا کافی ذخیرہ تھا چنانچہ خیمہ بھی صرف ادیم کے ٹکڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ ۶۔ قتب کی جمع اونٹ کے کجاوہ کے چوڑے اور پتلے تختوں کے ٹکڑے۔

تھا، اور اسی طرح سے یاد کیا گیا، اور رسول خدا کو اسی طرح سے سنایا جاتا اور آپ کے سامنے پڑھا جاتا اور صحابہ کی بڑی جماعت نے اکثر بار حضور کو پورا قرآن اسی طرح سنایا جس سے صاف روشن ہے کہ قرآن حضور (صلعم) کے عہد میں مرتب تھا نہ کہ متفرق و غیر مرتب۔"

پھر نہ صرف یہ کہ اس کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا گیا تھا جس کو سرکاری جلد کہا جا سکتا ہے بلکہ بہت سے صحابہ کے پاس بھی پورا قرآن مکتوبہ شکل میں تھا اور بہت سے ایسے صحابہ بھی تھے جن کے پاس اگرچہ مکمل قرآن لکھا ہوا نہ تھا لیکن اس کا بہت بڑا حصہ تحریری شکل میں تھا اور یہ سب ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں کہ وقت کے بڑے بڑے مستشرقین تک ان کا اعتراف کرتے اور ان کی شہادت دیتے ہیں چنانچہ سرولیم میور نے لکھا ہے کہ:

"اس بات کے ماننے کی زبردست وجوہ ہیں کہ رسول کی زندگی ہی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہ کے پاس موجود تھے اور ان نسخوں میں پورا قرآن یا تقریباً تمام قرآن لکھا ہوا تھا۔"

اور ڈاکٹر راڈویل رقم طراز ہیں کہ:

"قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسول میں عام طور پر زیر استعمال تھے۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قرآن کے لکھے جانے اور اس کی نشر و اشاعت میں جتنی عظیم الشان وسعت ہوئی ہے اسے علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب "الفصل بین الملل والنحل" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت تمام عرب کا جزیرہ مسلمان ہو گیا تھا جو مغرب میں بحر قلزم سے لے کر سواحل یمن سے گزرتا ہوا مشرق میں بحر فارس پر ختم ہوتا ہے اور بحر فارس سے دریائے فرات پر گزرتا ہوا شام کے کنارے کنارے بحر قلزم پر ختم ہوتا ہے اور اس جزیرۂ عربیہ میں بیشمار شہر اور مواضعات ہیں، جیسے یمن، بحرین، عمان، نجد، قبیلہ طے کے دو پہاڑ (اجا و سلمیٰ)، قبائل مضر و ربیعہ و قضاعہ کے قصبات، طائف، مکہ، مدینہ وغیرہ، غرض یہ تمام جزیرہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اور اس میں کوئی شہر اور کوئی گاؤں اور کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو، اور ان تمام مسجدوں میں پانچوں وقت نماز میں قرآن پڑھا جاتا تھا۔ اور مسلمان اپنے بچوں اور عورتوں اور مردوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور ڈھائی سال خلیفہ رہے۔

فارس اور روم سے جہاد کیا، یمامہ کو از سر نو فتح کیا اور اب قرآن کو جاننے والے اور زیادہ ہو گئے اور بیشمار صحابہ نے جسطرح قرآن کو لکھا تھا اسی طرح بعد میں دیگر بلاد اسلامیہ میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے قرآن لکھا تھا اور کوئی شہر مسلمانوں کا ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے ہوتے نہ ہوں پھر خلیفہ اول کا انتقال ہوا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور تمام فارس، تمام شام، جزیرہ اور تمام مصر کو فتح کیا اور ان تمام بلاد اسلامیہ میں مسجدیں بنائی گئیں اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے نہ گئے ہوں، ہر ہر قریہ میں ائمہ نے قرآن سکھایا، مشرق و مغرب کے بے شمار مکتبوں میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی۔ اس طرح لاتعداد قرآن لکھے گئے۔ اور بدستور قرآن پڑھایا جاتا رہا اور دس سال کچھ مہینے یہی حالت رہی اور عہد عمرؓ میں مصر و عراق اور شام و یمن کی وسیع و عریض سرزمین میں ایک لاکھ سے کم نسخے قرآن کے مسلمانوں کے پاس نہ ہوں گے پھر حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا۔ اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور فتوحات اسلام بہت زیادہ ہوئیں اور اسی کے ساتھ قرآنی نسخوں اور مساجد وغیرہ تمام باتوں میں زیادتی ہوئی۔ اور اس زمانے میں قرآن کے اس قدر نسخے لکھے گئے اور مسلمانوں کے پاس موجود تھے کہ کوئی اس پر قادر نہیں کہ اس کا شمار بتا سکے اور اس کی تعداد کا اندازہ لگا سکے"

ماخذ دوم: السنة

تعریف معنی: سنت کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جس نے کوئی اچھی سنت قائم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور قیامت تک اس سنت کی پیروی کرنیوالے کے عمل کا بھی۔" لیکن عرف میں اس لفظ (سنت) سے مراد نبی کریم (صلعم) کا وہ ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپ نے بار بار عمل کیا جس کی آپ نے محافظت فرمائی اور جس کے حضور (صلعم) عام طور پر پابند رہے۔ اور پھر محدثین کی اصطلاح میں آکر اس لفظ (سنت) کے مفہوم کا دائرہ پھیل گیا اور اس سے مراد ہوا رسول کا قول، تقریر٭، اور آپ کی صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ ---------

٭ وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا اصطلاح میں تقریر کہلاتا ہے

بھی بیان کیا گیا ہے اس اصطلاح کی رو سے "سنت" لفظ "حدیث" کا مرادف ہے۔

قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے اور قرآن کے بعد اس کا درجہ آتا ہے کیونکہ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے لیکن قرآن سے مرتبہ میں موخر ہونے کے باوجود ایک جہت سے سنت بجائے خود ایک مستقل مصدر قانون ہے کیونکہ سنت میں ایسے احکام بھی وارد ہوئے ہیں جن پر قرآن خاموش ہے مگر اس جہت سے مستقل مصدر تشریع ہونیکے باوجود سنت قرآن کے تابع ٹھہرتی ہے کیونکہ وہ قرآن کا بیان و تفسیر ہونیکے علاوہ ان مقامات پر بھی قرآن کے مبادی اور اس کے قواعد عامہ سے متجاوز نہیں ہوتی جہاں قرآن خاموش ہے۔

حجیت حدیث و سنت: حدیث اور سنت دونوں مرادف ہوں جیسا کہ محدثین کی اصطلاح ہے یا سنت کو رسول کے طریق عمل کے لیے خاص سمجھا جاتے اور حدیث کو قول رسول کے لیے بہرحال حدیث و سنت کی حیثیت دین میں سند اور حجت ہونگی ہے اور ہر ثابت شدہ سنت اور ہر وہ ارشاد یا عمل جسکی رسول کیطرف نسبت ہو اور وہ قرآنی معیار اور اصول روایت و درایت کی رو سے بظن غالب بھی صحیح ٹھہرے، وہ جمہور امت مسلمہ کے عقیدے میں واجب التسلیم ہے اور یہ بات ایسی نہیں جسکے لیے کسی قسم کی باریک بینی اور علم و بصیرت کی ضرورت ہو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا کو خدا مان لینے کے بعد اسکی فرمانبرداری ضروری ہوجاتی ہے کیونکہ عقل عام تک اس بات کو جائز اور ممکن نہیں سمجھتی کہ ایمان تو ہو مگر وہ اپنے اندر کسی طرح کی اطاعت کا مطالبہ نہ رکھتا ہو، اسی طرح رسول کو رسول مان لینے کے بعد رسول کے ہر قول اور ہر عمل کو رضائے الٰہی کی یقینی اور واحد کلیہ باور کرنا ضروری ہے اور رسول پر ایمان بھی اپنے اندر رسول کی اطاعت و اتباع کا مطالبہ رکھتا ہے، خواہ رسول کا جسمانی وجود بھی ہو یا اس کا صرف ارشاد یا طریق عمل سامنے ہو۔

تاہم حدیث و سنت کی حجیت اور ان کے دینی سند ہونے سے متعلق بنیادی نکات کے طور پر چند دلائل درج ذیل ہیں۔ ان دلائل کو ہم آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(الف) قرآن کی اندرونی شہادت (ب) خارجی شہادت
اور پھر خارجی شہادت کے دو شعبے ہوتے ہیں۔
(۱) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابۂ کرام کے بعد علمائے امت کی حدیث وسنت کے حجت ہونیکی شہادت
(۲) عقلی حیثیت سے اس کی حجیت کا ثبوت۔
جہاں تک قرآنی تصریحات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے قرآن کی بیشمار آیات میں سے چند یہ ہیں۔

لقد من اللہ علی المومنین	یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا،
اذ بعث فیھم رسولاً من	جبکہ اس نے ان میں ایک رسول بھیجا
انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ	جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتاہے، اور
ویزکیھم ویعلمھم الکتاب	ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب و
والحکمۃ۔ (آل عمران ع ۱۷)	حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فریضۂ رسالت محض اللہ کی آیات کا دوسروں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آیات الہٰی کی تعلیم بھی ہے۔ اور تعلیم الفاظ کے سنا دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ مشکل مطالب کا حل کرنا اور مجمل و مبہم باتوں کی تفصیل وتشریح کو تعلیم کہتے ہیں۔ اور تعلیم کبھی صرف زبان سے ہوتی ہے کبھی صرف عمل سے ہوتی ہے اور کبھی زبان و عمل دونوں سے ہوتی ہے۔ اور یہی وہ "تعلیم کتاب وحکمت" ہے جو احادیث وسنن کے نام سے مشہور ہے۔ لہذا اللہ کی جانب سے مامور کئے ہوئے اس معلم الکتاب صلعم کی تعلیمات کو درمیان سے ہٹا کر محض اپنی عقل وفکر کے بل بوتے پر الکتاب (قرآن) کا کوئی مفہوم متعین کیا جائے گا تو اس کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ وہ یقیناً خدا کی مراد ومنشا کے مطابق ہے لیکن رسول کی زبان وعمل سے بیان کئے ہوئے قرآنی مفہوم کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدا کی مراد ومنشا کے ٹھیک ٹھیک مطابق نہ ہو کیونکہ آپ (معلم) یہ کام وحی کی نگرانی میں کرتے تھے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (النساء - ۱۰۵)

(اے محمد) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم اس طرح فیصلہ کرو جس طرح اللہ تم کو دکھائے۔

اسی "ارائۃ الہٰی یعنی اللہ کے دکھانے) کی رہنمائی میں کتاب وحکمت کی وہ تعلیم ہے جیسا دوسرا نام حدیث وسنت ہے

پھر اس آیت میں "بما اراک اللہ" کا جملہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ بما رأیت (جیسا کہ تم دیکھو) نہیں کہا گیا ہے بلکہ بما اراک اللہ (جیسا کہ اللہ تم کو دکھائے) کہا گیا ہے، ارائۃ (دکھانا) اور تنزیل (نازل کرنا) استعمال ومفہوم اور معنی کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں تنزیل کا تعلق اُس وحی سے ہے جو الفاظ کے ساتھ نازل ہو اور ارائۃ میں وہ الہام والقا داخل ہے جو بذریعہ الفاظ نہ ہو اور لفظ وحی لغت اور حقیقت کے لحاظ سے تنزیل اور ارائۃ دونوں کو شامل ہے یہی وہ "بما اراک اللہ" ہے جسکو محدثین اور ائمہ مجتہدین اپنی اصطلاح میں "وحی خفی" یا "وحی غیر متلو" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی وہ "ارائۃ" (دکھانا) جس کا اظہار وبیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ واعمال (حدیث وسنت) کے ذریعہ وتوسط سے کیا اللہ کی ارائۃ تو ہے۔ مگر الفاظ نہیں جس کی تلاوت کی جائے لہذا کسی بات سے متعلق رسول کی تعلیم کسی امر سے متعلق رسول کی تفصیل وتشریح اور کسی معاملہ سے متعلق رسول کا فیصلہ محض ایک بشر کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ارائۃ کا نتیجہ اور فراست نبویہ کا وہ فیصلہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسول کا شریک وسہیم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

پس یہ آیت اس بات پر صراحتًا دلالت کر رہی ہے کہ حضور صلعم پر ایک تو تنزیل (انا انزلنا۔۔۔۔) ہوئی اور اس کا مصداق قرآن ہے اور دوسری چیز حضور صلعم کو ارائۃ الہی (بما اراک اللہ) عطا ہوئی، جو اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے تنزیل سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس ارائۃ الہیٰ (وحی خفی یا وحی غیر متلو) کا بھی کوئی مصداق ہونا چاہئے اور وہ یہی حدیث وسنت ہے

اور پھر اس "ارائۃ الہیٰ" کی شہادت خود قرآن میں بکثرت ہے بطور مثال کے صرف دو آیتیں درج ذیل ہیں۔

(الف) سورۃ القیامۃ میں ارشاد ہوا ہے۔

ان علینا جمعہ وقرآنہ	اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے
ثم ان علینا بیانہ (القیامۃ)	... پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے

اس آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں، اور ان تینوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔
(۱) جمع قرآن (۲) قرآن کا پڑھا دینا (۳) قرآن کا بیان

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق کوئی ایسی آیت نہیں جس سے یہ واضح ہو کہ اللہ نے رسول صلعم کو بذریعہ تنزیل یہ ہدایت دی ہو کہ فلاں فلاں آیت کو فلاں فلاں مقام پر رکھو۔ یہ کام رسول نے بغیر تنزیل کے کیا، لیکن کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول کا یہ کام محض نجی حیثیت سے تھا اور اسکو رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا اور یہ کہ رسول صلعم نے قرآن کی آیات اور اس کی سورتوں کو جس ترتیب سے جمع کیا، اس کی نگرانی و رہنمائی خدا نے نہیں کی تھی۔

اس کے برخلاف رسول کے اس کام کو اللہ نے اپنی طرف (علینا) منسوب فرمایا اسی طرح قرآن کا بیان اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (ثم ان علینا بیانہ) اور بیان کہتے ہیں توضیح و تشریح کو مجمل کی تفصیل کو اسکے منشا کی تعیین کو اور اشارات کی وضاحت کو اب سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو اصولی اور مجمل احکام ہیں اس آیت کی رو سے انکا بیان اور انکی تفصیل و تشریح منجانب اللہ ہونی چاہیے یا نہیں؟ ظاہر ہے جواب اثبات میں ہوگا، کیونکہ ان کے بیان و تفصیل اور تشریح کو اللہ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن قرآن ان کی تفصیل و تشریح سے خاموش ہے اور حدیث و سنت ان کی تفصیل و تشریح پیش کرتی ہیں اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث و سنت تنزیل نہ ہونیکے باوجود اطاعۃ الہی اور وحی میں داخل ہیں جبھی قرآن کے مجمل اور اصولی احکام کی تشریح و بیان کی نسبت اللہ کیطرف (ثم ان علینا بیانہ) صحیح ہوگی باوجودیکہ وہ تشریح و بیان حدیث و سنت میں ہے

حدیث و سنت کا بیان القرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے مثلاً

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم النحل - ۴۴)	ہم نے آپ کی طرف الذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے آپ اس چیز کی وضاحت کردیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیه (النحل ع ۶)	ہم نے آپ پر (الکتاب) اسی لیے تو نازل کی ہے تاکہ آپ اسکو واضح کردیں جسمیں انہوں نے اختلاف کیا

(ب) بنی نضیر جب اپنے مکانات سے نکال دئے گئے اور ان کے کھجوروں کے درختوں میں کچھ کاٹ دیے گئے اور کچھ چھوڑ دئے گئے تو اس واقعہ سے متعلق قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ

ماقطعتم من لینة او ترکتموھا قائمة علی اصولھا فباذن اللّٰه - (الحشر - ۵)	کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا اپنے جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو وہ خدا کے اذن سے تھا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس موقع پر درختوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم دینا از روئے وحی تھا مگر قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اس حکم خداوندی پر دلالت کررہی ہو معلوم ہوا کہ وہ حکم خداوندی بذریعہ تنزیل نہ تھا۔ بلکہ بذریعہ اراءۃ الہٰی یا بذریعہ وحی خفی تھا۔

اب اخیر میں سورۃ آل عمران کی وہ آیت بھی پیش نظر رکھنے کی ہے جس میں صحابہ کرامؓ کو اہل کتاب کے ہتکنڈوں سے ہوشیار کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ:

وکیف تکفرون وانتم تتلیٰ علیکم آیات اللّٰه وفیکم رسوله (آل عمران - ۱۰۱)	اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہئے درانحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں ہیں ایک تو اللہ کی آیات اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم و تلقین اور فیض صحبت اور اثر سے لوگوں کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ لہٰذا آج جبکہ اللہ کی آیات یعنی قرآن تو ہے مگر رسول کا جسمانی وجود ہمارے درمیان نہیں تو ہدایت کا وہ دوسرا سرچشمہ حدیث وسنت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

پس جب حدیث وسنت کا یہ مقام ومرتبہ متعین ہوگیا کہ وہ تعلیم الکتاب ہے، بیان وتوضیح کتاب ہے اور اراءۃ الہٰی کی مصداق ہے تو اب اس میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ حدیث وسنت کی حیثیت محض تاریخی نظائر کی نہیں ہے، بلکہ وہ دینی مقام رکھتی ہیں، دینی سند ہیں اور دین میں حجت ہیں۔

رہا حدیث وسنت کا واجب التسلیم ہونا، تو اگرچہ ان کے دینی سند وحجت کے ثبوت کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ ان کے واجب التسلیم ہونے کے بھی دلائل ذکر کئے جائیں پھر بھی چند قرآنی تصریحات اس کی بابت درج ذیل ہیں۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ - (النساء-٦٤)	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

اس سے اصولی طور پر معلوم ہوا کہ رسالت اور مطاع (جس کی اطاعت کی جاتے) ہونا لازم و ملزوم ہے کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اسے واجب الاطاعت یقین کرنا ہے۔

دوسری بات یہاں یہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ یوں نہیں کہا گیا ہے کہ وما انزلنا من کتاب الا لیعمل (یعنی ہم نے کسی کتاب کو نہیں نازل کیا مگر اس لیے کہ اس پر عمل کیا جائے) بلکہ فرمایا گیا ہے کہ "وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ" اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کتب منزل من اللہ واجب الاتباع ہوتی ہیں، اسی طرح انبیاء ورسل کی ہستیاں بھی بالاستقلال واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہوتی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے کتاب کے بغیر تو انبیاء کو مبعوث فرمایا ہے مگر نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی ہے اور ہر نبی، عام ازیں کہ اس پر کتاب نازل کی گئی ہو یا بغیر کتاب کے اس کی بعث ہوئی ہو، چونکہ وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے اس لیے فرمایا کہ "وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ"

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول"، "اطیعوا اللہ ورسولہ" جیسے جملوں کے ذریعہ اطاعت الٰہی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول کا بھی حکم ہے لہذا جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر الرسول اور رسولہ کا صدق واطلاق ہوگا اور جتنے لوگ آپ کی رسالت کی تصدیق کریں گے، ان پر آپ صلعم کی اطاعت واجب ہوگی اور اطاعت رسول کا فقرہ کہیں یا حدیث وسنت پر عمل کہیں بات ایک ہی ہے محض لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم - (الاحزاب-٣٦)	اور کسی مومن مرد اور عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اسکے رسول کسی امر کا فیصلہ کردیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملہ میں (اس فیصلے کے قبول وعدم قبول کا) کوئی اختیار نہیں۔

یہ آیت اُس امر کے لیے نص ہے کہ جب تک محمد صلعم پر رسولہ (اللہ کا رسول) کا اطلاق ہوگا، اُس وقت تک آپ صلعم کی ہر اُس بات کا بے چون وچرا تسلیم کرنا لازم ہے جس پر "ما قضیٰ رسولہ" (جو اللہ کا رسول فیصلہ کر دے) صادق آتا ہے اور حدیث وسنت یہی ما قضیٰ رسولہ ہے۔

نہ صرف رسول صلعم کی اطاعت کا حکم ہے بلکہ رسول کی اتباع ٭ کا بھی حکم ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ ۔ ۔ ۔ (الاحزاب ۲۱)	(مسلمانو!) تمہاری پیروی کے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین اسوہ ہے۔

اور یہ تاکید اس لیے کی گئی ہے کہ قرآن پر پوری طرح عمل کر کے ہی خدا کی فرمانبرداری کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور خدا کی فرمانبرداری ہی کر کے کوئی شخص خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے اور خدا کا محبوب بندہ بننے کے لیے اتباع رسول کو شرط لازم ٹھہرا گیا ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔ ۔ ۔ (آل عمران ۔ ۳۱)	(اے نبی) کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو تب اللہ تم کو اپنی محبت سے نوازے گا۔

لہٰذا اس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا کی اطاعت کی واحد شکل اتباع رسول یعنی سنت رسول کی پیروی ہے۔

فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ وکلماتہ واتبعوہ ۔ (الاعراف ۔ ۱۵۸)	پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو خدا اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کرو۔

اس آیت میں اللہ پر ایمان کا مطالبہ ہے اور رسول کی اتباع کا حکم ہے اس میں باریک نقطہ یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد آپ سے آپ اطاعت الٰہی لازم ٹھہر جاتی ہے تو اس اطاعت الٰہی کے باب میں بتایا کہ اس کی واحد شکل اتباع رسول ہے۔

٭ اطاعت حکم کی تعمیل کرنے اور سر تسلیم خم کر دینے کو کہتے ہیں۔ اور اتباع نام ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، نہ صرف کسی کے عمل کی طرح عمل کرنا بلکہ اس لیے اس کے عمل کی طرح عمل کرنا کہ اس نے وہ عمل کیا ہے۔ اتباع رسول کا مفہوم یہ ہوا کہ رسول کے عمل کی طرح اس لیے عمل کیا جائے کہ رسول نے وہ عمل کیا ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن نے جس طرح اللہ کی معصیت کو ضلالت کہا ہے اور اس کے مرتکب کو وعید سنائی ہے اسی طرح رسول صلعم کی معصیت کے ارتکاب کو بھی ضلالت قرار دیا ہے اور ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب ٹھہرایا ہے۔

ومن یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا۔ (الاحزاب ۔۳۶)	اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔
ومن یعص اللہ و رسولہ فان لہٗ نار جھنم خالدین فیھا ابدا ۔(الجن ۔۲۳)	اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا تو ایسے شخص کے لیے نارِ جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے
یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض۔ (النساء ۔ ۴۲)	اس قیامت کے) دن وہ سب لوگ جو رسول سے سرکشی کرتے ہوئے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جاتے اور وہ اس میں سما جائیں۔

ان آیات خصوصاً آخر الذکر کو آیت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن سے انحراف ضلالت اور باعث سزا ہے اسی طرح حدیث وسنت سے بے نیازی اور اعراض بھی ضلالت ہے اور اس سے سرکشی کا نتیجہ دردناک عذاب اور آخرت میں رسوائی ہے۔

* قرآن کی اندرونی شہادت کے بعد خارجی شہادت کے "تاریخی شواہد" والے شعبہ پر بھی اس لیے طائرانہ نظر ڈال لینی مناسب ہے کہ قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا (النساء ۱۱۵)	جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی اور مومنین کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے۔

صحابۂ کرامؓ اور ان کے بعد دینی روش پر چلنے والے علماء و صلحاء نے حدیث وسنت کو دینی حجت و سند باور کیا اور چونکہ حدیث وسنت کا دین میں سند و حجت باور کرنا بھی ایک "سبیل المؤمنین" قرار پاتا ہے اور چونکہ صحابہ اور ان کے بعد جمہور علماء حدیث وسنت کو سرمایۂ دین سمجھتے تھے تو پھر حدیث وسنت کی حجت سے انکار کرنا "سبیل المؤمنین" سے روگردانی کرنے کے مرادف ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویہ کو دیکھئے صحابہ ہر معاملہ میں دیکھتے تھے کہ آپ کا رویہ کیا رہا ہے اور ہر موقع پر آپ ہی کے اسوہ کی پیروی کرتے تھے اور انسانیت کے یہ گلہائے سر سبز جس کو صاحب امر بناتے تھے وہ پہلی بات یہ کہتا تھا کہ میری اطاعت کرو اگر میں خدا اور اسکے رسول کی اطاعت کروں اگر میں خدا کے احکام اور رسولؐ کی سنت سے سر مو بھی انحراف کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ تقلید۔

صحابۂ کرامؓ کے بعد ہر دور کی معتبر و معتمد تاریخ کا یہ ناطق فیصلہ ہے کہ محدثین و فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے حدیث و سنت کو دینی سند تسلیم کیا ہے اور حدیث و سنت کو قرآن کے بعد اسلامی قانون کا ایک مستقل ماخذ قرار دیتے رہے ہیں چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں ملتا جس نے بجائے خود حدیث و سنت کا انکار کیا ہو۔

اب رہ جاتا ہے عقلی ثبوت۔ تو جیسا کہ ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ عقل عام تک کا تقاضہ اور فیصلہ یہ ہے کہ حدیث و سنت کو حجت اور سند کا مرتبہ حاصل ہو۔ اور محض تاریخی یا علمی نقطۂ نظر کی حد تک اس پر توجہ نہ دی جائے، کیونکہ سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا؟ کیا خدا اس پر قادر نہ تھا۔ کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اتار دیتا اور ان کا ایک ایک نسخہ نوع بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا؟ یقیناً وہ اس پر قادر تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ — کیونکہ یہ تو بظاہر ہدایت کا یقینی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الٰہی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ انہی کے نمونہ کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء - ۹)

(یعنی) ہم نے جو رسول بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اگر محض کتاب اللہ اتار دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا۔ تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے اور کوئی اسکا فیصلہ کرنیوالا نہ ہوتا۔ لوگ احکام کے منشا سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشا بتلانے والا نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے اور احکام رسول کی اطاعت اور اسوہ رسول کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول یا اسوۂ رسول کو نہ لیں گے وہ دراصل رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہے اور وہ اس واسطے کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطہ کے طور پر قائم فرمایا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لیے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ (معاذ اللہ) کتاب کو رسول کے ذریعے سے نازل فرمایا۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجیے کہ آیا رسول اللہ (صلعم) کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی صرف ان کی حیات جسمانی تک تھی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپ (صلعم) اپنے جسم مبارک کے ساتھ زندہ تھے اور آپ (صلعم) کے رحلت فرماتے ہی آپ (صلعم) کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہو گیا اس صورت میں رسالت کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے رسول کا کام اگر محض ایک نامہ بر کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی تو جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ اس صورت میں رسول کی ضرورت ہی نہ تھی یہ کام کوئی فرشتہ کر سکتا تھا بلکہ بلا واسطہ بھی ممکن تھا۔

لیکن اگر کتاب پہنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اسی کے لیے اتباع کا احکام دئے گئے تھے اور اگر ہدایت نوع بشری کے لیے قرآن کے ساتھ رسول کی ہدایات اور سیرت نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر یہ سب صرف تئیس یا چوبیس سال کے لیے ہوتا کیا معنی رکھتا ہے محض ایک صدی کے چوتھائی حصہ کے لیے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدت کے لیے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا اور ایک چیز کو جو رسول کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہونے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری ہو جانیوالی تھی اتنی شد و مد کے ساتھ ذریعہ ہدایت قرار دینا، یہ سب کچھ بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ جو (معاذ اللہ) خدا کے

حکیم و دانا کے ہرگز شایان شان نہیں ہے اور جب ایسا ہے (یعنی نبی اکرم صلعم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لیے ہے) تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لیے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری قرار دی گئی ہے آپ کی ذات کو اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے آپ کے اتباع کو رضائے الہیٰ کے حصول کا واحد ذریعہ کہا گیا ہے اور ہدایت کا دامن آپ کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے (وان تطیعوہ تھتدوا) تو رضائے الہیٰ حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت ظاہر ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے۔ اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو بھی رہے گی۔

پھر یہ بات کیسی موٹی ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ دین میں کوئی چیز حجت اور سند نہیں ہے اور رسول کا قول دینی حیثیت سے کوئی مقام نہیں رکھتا تو پھر رسول کا قرآن کے بارے میں یہ کہنا بھی قاعلے سے حجت نہ ہونا چاہیئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے پس جب قرآن کے علاوہ نبی کا ایک قول بھی حجت بن گیا تو پھر رسول کے دیگر اقوال کی حجت کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟ حجت کا دروازہ ایک قول کے لیے کھلتا ہے تو سب کے لیے کھلے گا اور بند ہو گا۔ تو ہر قول کے لیے بند ہو جائے گا۔ اور یہ بات تو بالکل قطعی ہے جس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ حدیث و سنت کے بغیر تو دراصل قرآن سے بھی اکتساب ہدایت ممکن نہیں ہے احادیث و آثار اور روایات کے بغیر تو خود آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔

اور رسول کی سنت کی پیروی جس طرح آپ کی حیات میں ضروری تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی آپ کی صاف تاکید ہے "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے کتاب اللہ اور میری سنت"، حضرت ابن عباس کے واسطے سے یہ فرمان نبوی قابل غور ہے۔

"جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کچھ رکھا جائے تو وہ واجب التعمیل ہے اسکے ترک میں کسی کے لیے عذر جائز نہیں اگر کوئی چیز اللہ سے نہ ہو لیکن نبی کی سنت سے ہو تو وہ بھی ویسی ہی واجب التعمیل ہے"

ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور نے فرمایا جو میرے بعد زندہ رہے گا۔ وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنت اور میرے راست رو ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے پر جمے

رہنما اور خیر دار محدثات اور بدعات سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے"۔

ان تفصیلات سے یہ بات آپ سے واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے جب اسوۂ رسول کی پیروی کی تاکید فرمائی، جب اتباع رسول کو خدا کا محبوب بندہ بننے کے لیے شرط لازم قرار دیا، جب معصیت رسول پر وعید سنائی، جب اطاعت رسول کا حکم دیا، جب حدیث و سنت کو بیان قرآن اور تعلیم الکتاب قرار دیا تو ظاہر ہے کہ رسول کے اسوہ اور رسول کی حدیث و سنت کو محفوظ ہونا چاہیئے، ورنہ رسول کی اطاعت و اتباع اور تعلیم و تشریح قرآن پر عمل ایک ناقابل عمل حکم ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ خدا نے اس کی حفاظت کے سامان بھی فراہم کر دیئے اور وہ آج تک محفوظ ہے۔ یہ سنت و قرآن میں محفوظ ہے امت کے تعامل کی شکل میں محفوظ ہے تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور ان روایات و آثار کے اندر محفوظ ہے جو قرآنی معیار اور روایات و درایت کے مسلمہ اصول پر پوری اتریں۔

کتابت، حفاظت اور تدوین: اوپر کی تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہو گی کہ حدیث کا تعلق براہ راست ایک خاص تخلیقی وجود یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے اور صرف ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان اس کا اصل دائرہ کار ہے۔ جب کہ عام تاریخی ذخیروں کا تعلق کسی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ وغیرہ یا اسی قسم کی اور منتشر اور پراگندہ چیزوں سے ہے جن کا احاطہ احادیث کے برخلاف آسان نہیں ہے۔

پھر یہ بات بھی بالکل روشن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخین یعنی صحابۂ کرام کا باہمی تعلق ایک عینی شاہد کا تھا۔ جس کی بنیادیں عشق و سرمستی، والہانہ محبت، اور عظمت و اطاعت کے جذبات پر قائم تھیں اور جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ فریقین کے درمیان کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا۔ نبی اور صحابہ مسجد میں، بازار میں، گھر میں، سفر میں، حضر میں، ہر جگہ ملتے تھے اسی لیے اس تاریخ (حدیث) کے ہر ہر واقعہ اور ہر ہر جزو کو، اور ایک ایک خط و خال کو

انہوں نے پوری طرح محفوظ رکھا تھا اور اسکو اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کر چکے تھے۔ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو تبلاتا تھا کیونکہ منیٰ کے میدان میں آپ (صلعم) خود اعلان فرما چکے تھے "اللہ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا" پھر حکم تھا "الا فلیبلغ الشاھد الغائب" (تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچاتا جائے) اور "ان باتوں کو یاد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہنا" کیونکہ "تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے" (حدیث) چنانچہ صحابۂ کرام جن حقائق و تعلیمات (حدیث) کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اسکا چھپانا وہ گناہ خیال کرتے تھے کیونکہ حضور کا ارشاد انہیں یاد تھا کہ "جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائیگی"۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں لیکن بعض سے یہ مروی ہے کہ اسوقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم چھپانے کا الزام ان پر نہ آئے حدیث بیان کرتے جاتے تھے (صحاح) لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے اس نے بار بار بکثرت انکی فطرت میں یہ تہدیدی خوف اسطرح راسخ کر دیا تھا کہ "جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اسکا ٹھکانا آگ (جہنم) میں ہوگا" اور عقل بھی تقاضا کرتی ہے کہ جس قسم کے ایمان و ایقان کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اسکی موجودگی میں خدا کے رسول پر جھوٹ باندھنے کی جرأت انکو نہیں ہو سکتی تھی اور جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے ان سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا تھا۔ جبکہ قرآن نے بھی مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے اس لیے بعض صحابہ اپنی اس نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس اس طرح کرتے کہ ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو کہتے "فرمایا اللہ صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرے پھر جو کچھ بیان کرنا چاہتے بیان فرماتے۔

جن مورخین کا تعلق اونچی تاریخ سے اس قدر ہو اور جن لوگوں کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو انہوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی زندگی جسکے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیئے گئے تھے، سوچنا چاہئے کہ ان ہی لوگوں نے اس "زندگی" کی نگہداشت میں کس اہتمام و انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا ایک ایک "موئے مبارک" جنکے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا انکے نزدیک آپکے اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی۔

ان حقائق کی روشنی میں عام تاریخی ذخیرے کیسے غیر معتبر نظر آتے ہیں جنکی بنیاد صرف پرانی قبروں کے کتبوں، سکوں کے ٹھپوں، کھنڈرات، سنگی یا برنجی تختیوں یا خود نوشت سوانح عمریوں پر قائم کی گئی ہے جنکے سند کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا بلکہ روایات اس رنگ کی بھی پائی جاتی ہے کہ یہ پرانی تختیوں کچھ دن ہوئے گاڑ دی گئی تھی"۔ پھر اس سے قطع نظر معاملہ ایک شخصی بیان سے آگے نہیں بڑھتا۔ عینی شاہدوں کا تو سوال ہی پیچیدہ ہے!

لیکن مسلمانوں کا یہ تاریخی سرمایہ "حدیث" ایک امتیازی شان رکھتا ہے جسکو قدرتی عوامل نے تدوین و تحفظ میں پوری مدد دی تھی۔ اسکے چشم دید گواہوں اور اسکے مورخین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرتی ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کا حصہ ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور باسورتھ اسمتھ کے الفاظ میں "یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تہہ تک وہ پہنچ سکتی ہے"۔

جہاں تک حدیث کی کتابت کا تعلق ہے ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ حدیث کی تدوین و ترتیب دو ڈھائی سو سال بعد صحاح ستہ کے زمانے سے ہوئی یا بہت آگے بڑھایا تو ابن شہاب زہری سے سلسلہ ملا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے حدیث کی تدوین جیسا کہ اوپر کے مختصر سے جائزہ سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی اور بعد کی پیداوار بالکل نہیں ہے۔

صحابہ کرام کا جنکا تعلق اوپر بتایا جا چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قسم کا تھا حدیث کے زندہ نسخے تھے اور تدوین حدیث کی پہلی صورت وہی قرار پاتے ہیں اور حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ دراصل ان ہی کی حفاظت و روایت کا رہین منت ہے اگر کتابی صورت میں احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہ کیا جاتا تو یہ ذریعہ بھی دراصل بہت کافی تھا۔ ہمارے یہاں حدیث کا بڑا حصہ تواتر ہی کے ذریعے پہنچا ہے۔

(۱) صحاح ستہ سے مراد حدیث کی چھ صحیح ترین اور قابل اعتماد ترین کتابیں ہیں جو اپنے مولفین کے نام سے جانی جاتی ہیں یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ۔

حفاظت حدیث کے اس ذریعے کے علاوہ دوسرا ذریعہ حفاظت کتابی شکل میں تدوین ہے اس سلسلے میں ذیل کی چند شہادتیں کافی ہوں گی۔

ہجرت مدینہ کے فوراً بعد ہی "پہلا تحریری دستور مملکت" کتابت حدیث کا پہلا ثبوت ہے جو آپ (صلعم) نے ریاست مدینہ میں نافذ فرمایا اور جس میں قریش، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و یہودی کے حقوق کا تعین ہے اسی طرح ہجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ نے مردم شماری کی۔ آپ کے الفاظ ہیں "مجھے ان لوگوں کے نام لکھ دو جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں"۔ سرکاری دستاویزوں اور معاہدوں، پروانوں وغیرہ کا آغاز تو ہجرت سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ تعلیم داری کو فلسطین کا شہر جبرون بذریعہ پروانہ آپ صلعم نے جاگیر میں دیا تھا یا سفر ہجرت میں سراقہ بن مالک کو پروانہ امن عطا فرمایا اس سے قطع نظر سنہ ۱ ہجری میں قبیلہ جہینہ سے حلیفی کا معاہدہ ہوا یا بنی ضمرہ سے معاہدہ کا مخطوطہ اب تک ملتا ہے یہ معاہدوں کا سلسلہ ہے پھر جاری رہا۔ سنہ ۵ ہجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور غطفان سے آپ صلعم نے ایک توثیق طلب یا مسودہ معاہدہ کیا تھا جسے بعد میں محو کر دیا گیا۔ یا سنہ ۶ ہجری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اسکے بعض الفاظ پر جھگڑا مشہور ہے سنہ ۹ ہجری میں آل اکیدر دومۃ الجندل سے اطاعت کا معاہدہ، اور قیصر و کسریٰ مقوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روانگی معروف چیزیں ہیں کسریٰ نے نامہ مبارک جو تحریری صورت میں تھا، چاک کر دیا تھا انتظامی ضرورتوں سے اکثر مواقع پر آنحضرت صلعم نے جزیرہ نمائے عرب کے اطراف و اکناف میں اپنے ہر جگہ کے گورنروں قاضیوں وغیرہ کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات و فرامین تحریری صورت میں روانہ کئے تاریخ میں محفوظ ہیں خطوط پر ثبت کرنے کے لیے آنحضرت صلعم کا ایک مہر تیار کرانا بھی معروف واقعہ ہے غرض ایسی سیاسی وغیرہ سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلعم اور عہد صحابہ ہی میں شروع ہو چکا تھا۔

عہد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ نجی طور پر اور اتفاقی حیثیت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی بکثرت شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً فتح مکہ کے موقع پر آپ نے جو اہم خطبہ دیا تھا۔ ایک یمنی شخص ابوشاہ کی درخواست پر انہیں لکھوا کر دے دیا یا عتبان بن مالک انصاری کو آپ کے ایک خطبے کی بات بڑی اچھی لگی انہوں نے اسے لکھ لیا۔

اگرچہ چند ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن کے سوا آپ صلعم سے سنی ہوئی کسی چیز کے لکھنے کی ممانعت فرمائی جس پر لکھی ہوئی چیزیں مٹا دی گئیں بلکہ ایک مرتبہ تو کہتے ہیں کہ خاصی تعداد میں جلا بھی دی گئیں لیکن غور سے چھان بین کرنے پر نظر آتا ہے کہ انکا تعلق یا تو ابتدائے اسلام سے تھا یا ایسے لوگوں کے متعلق تھا جو تازہ مسلمان ہوتے تھے اور قرآن وحدیث میں فرق نہ کر سکتے تھے جنہیں قرآن خوب یاد تھا اور جنکی صلاحیتوں پر اطمینان تھا تو آنحضرت صلعم نے انہیں حدیث لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب بھی دی ہے مثلاً ایک انصاری نے اپنے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا "اپنے دہنے ہاتھ سے مدد لو" (لکھ لو) اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص رض آنحضرت صلعم کی اجازت سے ملفوظات نبوی لکھا کرتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ لیں۔ لوگوں نے انہیں منع کیا کہ رسول اللہ ایک بشر ہیں کبھی خوشی اور کبھی خفگی کی حالت میں ہوتے ہیں اس لیے بلا امتیاز آپ کی ہر بات کو لکھ لینا مناسب نہیں ہے عبداللہ بن عمر نے اس پر جب رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا "کیا رضامندی اور غضب ہر حالت میں جو آپ کہیں لکھ لیا کروں"؟ آپ صلعم نے فرمایا "ہاں، بخدا اس سے (منہ سے) جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہی ہوتا ہے" چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک ہزار حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا جسکا نام "صادقہ" رکھا۔ اسی طرح حضرت علی، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت سعد بن ربیع حضرت سمرۃ بن جندب حضرت عبداللہ بن ربیعہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ نے حدیثیں جمع کیں۔ اور مجموعے مرتب کئے۔ وہب بن منبہ شاگرد حضرۃ جابر بن عبداللہ رض ہمام بن منبہ شاگرد حضرۃ ابوہریرہ رض، سلمان بن قیس شاگرد جابر رض وغیرہ کے مجموعے مشہور ومعروف ہیں ام المومنین حضرت عائشہ رض کو پڑھنا تو آتا تھا مگر خود لکھتی نہ تھیں چنانچہ ان کے بھانجے عروۃ بن زبیر نے ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی حدیثیں بھی لکھی تھیں جو جنگ حرہ میں تلف ہوئیں جنکا انہیں ساری عمر غم رہا۔ حضرت عائشہ کے دوسرے شاگرد عمرۃ بنت عبدالرحمان اور قاسم بن محمد تھے۔ ان کے پاس بھی احادیث کا ذخیرہ تھا حضرت ابوبکر رض نے کوئی پانچ سو احادیث کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر تلف کر دیا کہ کہیں "مجھ" سے کوئی غلط لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو گیا ہو۔ حضرت عمر رض نے بھی احادیث نبویہ کو حکومت کی جانب سے

جمع کرنے کا اہتمام کیا اور صحابہ کرام نے اس کے موافق مشورہ بھی دیا لیکن پھر آپ نے یہ ارادہ منسوخ کر دیا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے تو وفات کے بعد ایک بار شتر تالیفات کا چھوڑا تھا۔ عبداللہ ابن عمر کے غلام نافع املا لکھا کرتے تھے۔

غرض حدیث کی کتابت، اس کی حفاظت، اور جمع و تدوین کا آغاز حضور صلعم کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا جسے صحابۂ کرام نے وسعت دی اور تابعین نے اضافے کئے لیکن صحاح ستہ کے مرتبین نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا اور آج خدا کی کتاب کے بعد انسانی ذخیرۂ علم میں جو چیز سب سے زیادہ معتبر اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے۔ وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔

ماخذ سوم: "اجتہاد"

تعریف "اجتہاد" کے لغوی معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ یعنی دین کے سرچشموں سے احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا*

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"ارباب اصول کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کیا جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔"

(جلد ۴ صفحہ ۲۱۸)

امام شاطبی "الموافقات" میں اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں۔

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔"

(جلد ۴ صفحہ ۸۹)

اجتہاد قانون و شریعت اسلامی کا تیسرا ماخذ ہے اور اجتہاد کی صورت میں چونکہ براہ راست کتاب و سنت کے نصوص سے حکم معلوم کرنے کے بجائے کوشش

* فلسفۂ شریعت اسلام از صبحی محمصانی۔

کرکے کتاب وسنت کے اشارات سے ایک حکم معین کرنا پڑتا ہے اس وجہ سے اس کو کتاب یاسنت کے الفاظ کے بجائے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

* شرعی اصطلاح میں اجتہاد چونکہ اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کتاب وسنت کے اشارات ومضمرات سے کوئی حکم معلوم کرنے کے لیے کیجاتی ہے اس لیے کوشش کے باب میں پہلی چیز جس کیطرف خود لفظ اجتہاد اشارہ کرتا ہے یہ ہے کہ یہ کوشش سہل انگارانہ یا نیم دلانہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ پورے دل و جان سے ہونی چاہئے اور تحقیق وتلاش کے سارے وسائل جو اس کار عظیم کے لیے مطلوب ہیں وہ سب استعمال ہونے چاہئیں حضرت معاذ بن جبلؓ والی مشہور حدیث کے یہ جملے قابل غور ہیں "اگر کتاب وسنت سے واضح احکام میں کوئی رہنمائی نہ ملی تو میں کوشش کرکے اپنی رائے متعین کرنیکی کوشش (اجتہاد) کرونگا اور اس کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا" یعنی یہ نہیں کرونگا کہ جو خیال ذہن میں آجائے اس کے مطابق معاملات کا فیصلہ کردوں بلکہ اپنے امکان کے حدود تک جستجوئے حق کرونگا حضرت معاذؓ کے یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہیں جو قرآن وحدیث تو درکنار سرے سے عربی زبان سے ہی کوئی مس نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود وسوسہ دل میں گزر جاتا ہے اس کو مجتہدانہ شان کے ساتھ پیش کرنے میں ذرا بھی باک نہیں کرتے۔

شرائط: اجتہاد ایک نہایت مشکل کام ہے اس کے لیے شریعت کا گہرا علم بھی ضروری ہے اور ان حالات کے مالہ وما علیہ سے بھی اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے جن کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے۔ قانون بجائے خود بھی ایک مشکل چیز ہے اس کے اندر حروف والفاظ تو درکنار رموز و اوقاف (جیسے کاما (،) اور ڈیش (–) تک کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے جب تک کسی شخص کو شریعت کے براہ راست سمجھنے کا علم حاصل نہ ہو وہ قانون کی عام چیزوں کے سمجھنے کا حق بھی ادا نہیں کرسکتا چہ جائیکہ وہ اجتہاد کرسکے۔ اجتہاد میں معاملہ صرف قانون کی واضح دفعات کے سمجھ لینے کا ہی نہیں ہوتا بلکہ شریعت کے مضمرات واشارات اور کتاب وسنت کے لوازم ومقتضیات کی روشنی میں نئے پیش آمدہ حالات کا شرعی حکم متعین کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ظاہر ہے۔ کہ نہایت

اعلیٰ فنی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے اور صرف فنی قابلیت ہی کی نہیں بلکہ ذوق سلیم بھی ضروری ہے۔ شریعت کے اعلیٰ علم اور اس کے فہم کے اعلیٰ ذوق کے بغیر کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے یہ بات تو صحیح ہے کہ اسلام میں اجتہاد کسی خاص طبقہ یا گروہ کا اجارہ نہیں ہے، لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام میں ہر شخص اجتہاد کا مجاز ہے جس کام کے لیے قابلیت کا ہونا بالکل بدیہی امر ہے اس کا مجاز ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر اجتہاد میں اس قابلیت کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی اخروی ذمہ داری کا بھی سوال ہے جو شخص اجتہاد کرتا ہے وہ صرف لوگوں کی دنیا ہی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا بلکہ ان کے دین اور ان کی آخرت کے معاملے میں بھی ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ نااہلیت کے باوجود اجتہاد کی جسارت کرتا ہے تو صرف اپنی ہی آخرت برباد نہیں کرتا بلکہ دوسرے بہت سے لوگوں کی آخرت بھی خطرے میں ڈالتا ہے۔

اجتہاد کی اس علمی و اخلاقی اہمیت کے سبب اس کے لیے اصول فقہ کی کتابوں میں جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ تین شرطوں اور سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ:

۱۔ اجتہاد کا اہل وہ شخص ہے جس کو کتاب و سنت پر پورا پورا عبور حاصل ہو۔

۲۔ وہ پیش آمدہ حالات و مسائل کی تہ تک پہنچنے والا اور ان کے ”ما لہ وما علیہ“ کو اچھی طرح سمجھنے والا ہو۔

۳۔ وہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے ایک قابل اعتماد آدمی ہو تاکہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔

ضرورت: اجتہاد کی ضرورت انسانی زندگی میں مسلم ہے کیونکہ زندگی برابر نت نئے مسائل سے دوچار رہتی ہے۔ ان مسائل کا حل اگر شریعت سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ہماری زندگی کا رابطہ شریعت سے ٹوٹ جائے گا اور اس کو کوئی مسلمان اسلام پر قائم رہتے ہوئے گوارہ نہیں کر سکتا۔ ہماری روحانی و ایمانی حیات کے لیے اس سے کہیں زیادہ ضرورت اجتہاد کی ہے جتنی ہماری مادی زندگی کے قیام و بقا کے لیے ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔

ہمارے سامنے جو مسائل اور حالات پیش آئیں اگر ہم ان کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کیے بغیر اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں نکلے گا کہ ان حالات کی حد تک ہماری زندگی غیر اسلامی ہو جائے گی۔ بلکہ اس امر کا بھی اندیشہ ہے کہ ان حالات کا دباؤ ہمیں اپنی زندگی کے بقیہ حصہ میں بھی اسلامی روش سے ہٹنے پر مجبور کر دے، حالانکہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے اسلام کے حکم اور اس کے اشارے کے مطابق اٹھائے۔ زندگی جن حالات و تغیرات سے گزرتی ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی مسلمان کے لیے ایسا نہیں آتا جس میں وہ اسلام سے استغنا کا محتاج نہ رہتا ہو۔ اپنی اس خصوصیت کے سبب مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کے بغیر اپنی اسلامیت کو برقرار رکھ سکے ؛

اسلامی نظامِ اخلاق

*جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے، انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے، اس کو بیان کرے، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کو واضح کرے نیز مفید اور کارآمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے، بلکہ مختصر الفاظ میں جو فضائل و رذائل کا علم بخشے اور یہ بتائے کہ انسان کس طرح فضائل سے مزین اور رذائل سے محفوظ رہ سکتا ہے اسں کو "علم الاخلاق" کہتے ہیں۔

لیکن بادنیٰ غور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی اعمال اس قسم کے نہیں ہیں کہ ان کے اچھے یا برے ہونے کا حکم دیا جا سکے۔ مثلاً سانس لینا، دل کا حرکت کرنا، تاریکی سے روشنی میں اچانک آجانے سے پلک جھپکنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان امور کے پیش نظر انسان کو نہ نیکو کار کہہ سکتے ہیں اور نہ غلط کار۔ اور نہ اس سلسلے میں اس سے کوئی محاسبہ کیا جا سکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال علم اخلاق کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ البتہ انسان سے جو اعمال ارادی طور پر انجام پاتے ہیں اور وہ انکو انکے نتائج و ثمرات پر غور کرنے کے بعد کرتا ہے مثلاً شفاخانے کی تعمیر یا اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ اور اس کی تدابیر میں کامیابی وغیرہ چونکہ یہ "ارادی اعمال" ہیں اس لیے ان پر ہی اچھے یا برے ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ انسان اس قسم کے اعمال کے لیے خدا اور مخلوق کے سامنے جواب دہ ہے، اور یہی علم اخلاق کا موضوع قرار پاتے ہیں؛

ہر ایک علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اندر شغف رکھنے والے کو ان امور کے بارے میں جن پر اس علم میں بحث ہوتی ہے ناقدانہ نظر عطا کرتا ہے چنانچہ علم اخلاق کی بھی یہی شان ہے کہ جو شخص اسکے ساتھ شغف رکھتا ہے یہ اسکو اعمال کے کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدرت عطا کرتا ہے اور ان کی صحیح اور پائدار تقویم پر اُسے ایسا حاوی کر دیتا ہے کہ ان کے متعلق حکم نافذ کرتے ہیں وہ لوگوں کے رجحانات اور تقلیدات کے زیر اثر نہیں رہتا بلکہ اپنے فیصلہ میں علم الاخلاق کے نظریات، قواعد، قانون اور قیاسات سے مدد حاصل کرتا ہے لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علم اخلاق کی غرض صرف نظریوں اور قاعدوں کی معرفت کے اندر ہی محصور و مقصود نہیں ہے بلکہ اسکے مقاصد عظمیٰ میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تاثیر اور کارفرما ہو کہ یہ تاثیر، ارادہ کو عمل خیر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی حیات کی تشکیل کریں۔ اپنے اعمال کو پاک اور عمدہ بنائیں۔ اور حیات انسانی کے لیے ایک اعلیٰ مثال قائم کر دیں۔ یعنی اپنے اندر حسن عمل، حسن کمال اور اخوت و مواسات عامہ جیسے فضائل پیدا کر دیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ "تاثیر" کو ہر موقع پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور فطرت انسانی اس سے متاثر نہیں ہوتی۔

علم اخلاق کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے خیر و شر اور نیکی و بدی کو واضح کر دیتا ہے اور اس طرح نیکی اور سچائی کی راہ کو آسان کر دیتا ہے اسکا کام جبری طور پر صالح بنا دینا نہیں، انسان کو صالحیت کی راہ دکھانا ہے جس پر چلنے یا نہ چلنے کا انحصار فرد کے ارادہ پر ہے یہ علم ایک طبیب کی طرح انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کرا دیتا ہے۔ اور اس کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو جان لے۔ اب آگے اس کی قوت ارادی کا کام ہے جو علم اخلاق کے اوامر و احکام کے اختیار اور اس کے نواہی (ممنوعات) سے پرہیز پر آمادہ کر سکے۔

اسلام کا نظریۂ اخلاق

*انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جس کی بناء پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے۔ کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق

کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے سچائی، انصاف، پاس عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو ہمدردی، فیاضی اور فراخدلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خود غرضی، سنگدلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا صبر و تحمل، استقلال و بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، چھچھورپن، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفرین کے پھول نہیں برسائے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آرہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسان کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو "معروف" اور بدی کو "منکر" کہتا ہے۔ یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ:
فالھمھا فجورھا وتقواھا (سورۃ الشمس) یعنی نفس انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر برائی اور بھلائی جانی اور پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو پھر دنیا میں مختلف اخلاقی نظام اور نظریے کیوں ہیں؟ اور اخلاق کے معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ کیا ہے جسے اسکی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے اور انکی حد، ان کا مقام اور انکا مصرف تجویز کرنے اور انکے درمیان تناسب قائم کرنے میں، یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاقی حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی

اختلاف ہے کہ قانون کے پیچھے وہ قوت نافذہ کونسی ہے جسکے زور سے وہ جاری ہو اور وہ کیا محرکات ہیں جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں لیکن جب ہم اس اختلاف کا کھوج لگاتے ہیں تو آخرکار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے۔ یہ ہے کہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیئے ہیں یہ ہے کہ انکے درمیان کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقاصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جڑ سے لیکر شاخوں تک انکی روح، انکے مزاج اور انکی شکل کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیا ہے۔

کائنات کے متعلق اسلام کا تصور یہ ہے* کہ اس دنیا کا ایک خالق و ناظم ہے وہی ہم سب انسانوں کا آقا ہے وہ حکیم ہے، قادر مطلق ہے کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سبوح و قدوس† ہے اور اسکی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جسمیں ٹیڑھ نہیں ہے انسان اسکا بندہ اور نائب ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھالے۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور اسے یہ جوابدہی اپنی مکمل ترین شکل میں آخرت میں کرنی ہے چنانچہ انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیئے کہ وہ آخرت کی جوابدہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے اسکی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے زندگی کے ہر پہلو کا امتحان ہے پوری کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے اسکی بے لاگ جانچ ہوئی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا اور جانچ ہستی کرنیوالی ہے جس نے زمین کے ذروں پر، ہوا پر، پانی پر اور خود انسان کے لیے دل و دماغ اور دست و پا پر، اس کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں اس کے خیالات اور ارادوں تک کا اسے پورا پورا علم ہے اور ان کی ہر تفصیل اس کے پاس محفوظ ہے۔

مقصد: یہ تصور کائنات و انسان اس اصلی بھلائی کو متعین کرتا ہے جسکا حصول انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیئے اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرز عمل کو پرکھ کے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اسکے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے

* تفصیلی بیان کے لیے ملاحظہ ہو باب ۵ "اسلام کا تصور زندگی"
† یعنی بہت پاک بے حد برکت والا اور لائق تعریف۔

جسکے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں اس کی بنا پر انسان کے سامنے ایک مرکزی مقصد آجاتا ہے جس کی روشنی میں زندگی میں اخلاقی صفات کی مناسب حدیں، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں اور ہمیں وہ مستقل اقدار ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوتے حالات میں اپنی جگہ قائم رہ سکیں پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقاء کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلہ پر بھی اغراض پرستوں کی آلائش اس کو ملوث نہیں کر سکتیں۔

ماخذ: معیار دینا کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصور کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے اس نے ہمارے علم اخلاق کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوتے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے بلکہ وہ ہمیں ایک معین ماخذ دیتا ہے۔ یعنی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت جن سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں۔ اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور شعبہ میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں انکے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق پایا جاتا ہے جو کسی مرحلہ پر کسی دوسرے ذریعہ علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

قوت نافذہ: پھر اسلام کے اسی تصور کائنات و انسان میں وہ قوت نافذہ بھی موجود ہے جسکا قانون اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی بازپرس کا اندیشہ اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک ایسی طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو۔ اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے۔ لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے۔

جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت، ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا، دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے دھوکہ نہیں دے سکتا، دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کرے بہرحال ایکدن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے۔ جہاں وکالت، رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے گا۔ اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ دل میں جاگزیں کر کے اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اسکو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو اسلام کے قانون اخلاق کی پشت پر اصل قوت یہی ہے جو اسے نافذ کراتی ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نور علیٰ نور، ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے، بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

محرکات: اسلام کا یہ تصور کائنات و انسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائے اور اس کی رضا کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرائے یہ اس بات کے لیے کافی محرک ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے جنکے متعلق اسے یقین ہو کہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک طاقتور محرک ہے۔ کہ جو شخص احکام الہٰی کی اطاعت کرے گا۔ اس کے لیے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے۔ اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائیگا۔ اسے ابدی سزا بھگتنا پڑے گی۔ چاہے دنیا کی چندروزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوت محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر

بھی اسے نیکی پر ابھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور ان مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پرلطف اور نفع بخش دکھائی دے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصور کائنات اپنا معیار خیر و شر، اپنا ماخذ علم اخلاق، اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محرکہ الگ رکھتا ہے اپنی چیزوں کے ذریعے سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے اسی بناء پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔

اسلامی تصور کی امتیازی خصوصیات: اس نظام کی امتیازی خصوصیات یوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں تین سب سے نمایاں ہیں جنہیں اسکا خاص عطیہ کہا جا سکتا ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لیے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقاء کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ایک ماخذ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے۔ جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے۔ مگر تلون اور بے رنگی کی گنجائش نہیں ہے خوف خدا کے ذریعہ سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے۔ اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اپج سے کام لے کر نرالے اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو بلا وجہ گھٹانے اور بعض کو بلا سبب بڑھانے کی کوشش کرتا ہے وہ انہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں جن کو انسانیت کسے اجتماعی ضمیر نے قبول کیا ہے اور ان میں سے بھی محض چند کو نہیں، بلکہ سب کو لیتا ہے پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے۔ اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی

سیاست، معاشی کاروبار، بازار، مدرسہ، عدالت، پولیس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس بین الاقوامی معاملات، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔ ہر جگہ، ہر شعبۂ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمران بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کی بجائے اصول اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو، اس کی دعوت یہ ہے۔ کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے۔ انہیں قائم کرے۔ اور پروان چڑھائے، اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آتی ہے۔ اس کی بیخ کنی کرے۔ اس دعوت پر جنہوں نے لبیک کہا انہی کو جمع کر کے اس نے ایک امت بنائی جس کا نام امت مسلمہ ہے۔ اور ان کو ایک امت بنانے کی واحد غرض یہی ہے۔ کہ وہ معروف کو جاری و قائم کرنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لیے منظم سعی کرے۔ اب اگر اسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو یہ ماتم کی جگہ ہے خود اس امت کے لیے بھی اور ساری دنیا کے لیے بھی۔

اخلاقی صفات

* ویسے تو ہر عمل صالح، اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے کیا جائے، تو اسلام کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور عبادت ہی کہلانے کا مستحق ہے، لیکن مسلمان مفکرین نے عوام کے لیے بات کو آسان اور قابل فہم بنانے کے لیے عبادت کا لفظ صرف ان اعمال صالحہ کے لیے مخصوص کر دیا ہے جن کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔

اعمال صالحہ کی دوسری قسم وہ ہے جس سے بحیثیت دعوت و اصلاح کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جو دراصل انبیاء علیہم السلام کے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو انہی کے مقصد کو پھیلانے کے لیے کرتے ہیں جیسے تبلیغ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکی کو قائم کرنا اور برائی سے روکنا)

اعمال صالحہ کی تیسری قسم وہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے ایسے ہی اعمال فنی اصطلاح میں اخلاق کہلاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جب انسان اپنے ہم جنسوں اور دوسری مخلوقات سے پیش آئے تو اس حیثیت سے کہ وہ کائنات کے مالک و آقا کا نمائندہ ہے اور ایک نمائندہ کا چونکہ یہ فرض ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اپنے کو اسی رنگ میں پیش کرے جو خود مالک کا رنگ ہے ایسے انسان کو وہ تمام صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جن کا موصوف خدا خود ہے مثلاً رحم ایک خلق ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ میں ہے اور وہ اس کی وجہ سے رحمان اور رحیم ہے پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر بھی رحم کی صفت پیدا کریں اور ہر قابل رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں۔ اسی طرح خطا اور قصور معاف کرنا اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں ٭

اخلاق کی تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کا تعلق خدا اور بندے کے باہمی رشتہ سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان قائم ہوتے ہیں معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات، سماجی برتاؤ ہو یا افراد خاندان سے سلوک، اسلام سب کو اخلاقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے قرآن و سنت میں معاملات و معاشرت سے متعلق بالتفصیل ان صفات کا ذکر ہے۔ جو خدا کو پسند یا ناپسند ہیں ان سب کا احاطہ کرنا اس مختصر باب میں مشکل ہے اس لیے صرف چند اہم صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پسندیدہ صفات

صبر: اسلام کو جو انفرادی اور اجتماعی محاسن انسانوں میں مطلوب ہیں ان میں ایک صبر ہے اردو میں صبر کے معنی بہت محدود ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ صبر کا مطلب بس یہ ہے کہ موت، بیماری اور فقر و تنگدستی جیسی مصیبتوں کو اس طرح برداشت کر لیا جائے کہ شور و فغاں اور شکوہ و شکایت کا

٭ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بندہ اپنے میں خدا کی تمام صفات کا پرتو نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا پیدا کرنا ضروری ہے کچھ صفات ایسی ہیں کہ جن کے تقاضوں کو پیدا کرنا ہوگا مثلاً خدا معبود ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے میں عبدیت پیدا کرے اس لیے جو بات یہاں کہی گئی ہے وہ عمومی نوعیت کی ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ہر صفت خداوندی کا رنگ بندہ پیدا کرے، کہیں ان صفات کو پرورش دینا ہوگی اور کہیں ان کے تقاضوں کو۔

اظہار نہ ہو اور کوئی ظالم اگر ظلم کرے تو اس کا انتقام نہ لیا جائے اور نہ نالہ و فریاد کی جاتے مگر قرآن کی زبان میں صبر کے معنیٰ اس سے بہت زیادہ وسیع و عمیق ہیں، مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو کچھ اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ کسی نیک کام کے لیے صدموں، تکلیفوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا اور ناموافق حالات میں بھی حق اور سچائی اور مضبوطی سے جمے رہنا اور نیکی کے راستہ پر چلتے رہنا صبر ہے، قرآن پاک نے صبر کو ایک ذریعہ قوت قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ "اے ایمان والو! (مشکلوں اور تکلیفوں میں) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو"

سچائی اور راستبازی: قرآن مجید سے جن اخلاقی صفات کی بہت زیادہ اہمیت و فضیلت معلوم ہوتی ہے ان میں ایک سچائی اور راست بازی ہے سچائی کا مطلب بھی صرف اتنا ہی نہیں کہ زبان سے غلط اور خلاف واقعہ بات نہ کہی جائے بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں دل کی سچائی اور عمل کی سچائی بھی شامل ہے دل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا نفاق اور کوئی دغا و فریب نہ ہو۔ اور عمل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو عقیدہ اور قول ہو وہی عمل بھی ہو اور ظاہر و باطن میں پوری یکسانیت ہو۔ جن بندوں کا حال یہ ہو وہی قرآن کی اصطلاح میں "صادق" ہیں قرآن و سنت میں صدق کو مومن اور منافق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے

عدل و انصاف: جن اخلاقی اور معاشرتی امور پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک عدل و انصاف بھی ہے یہ دراصل سچائی اور راستبازی ہی کی ایک شکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رو رعایت وہ معاملہ کیا جائے اور اس کے بارے میں وہ کھری بات کہی جائے جس کا وہ مستحق ہے اسی عدل و انصاف پر دنیا کا انتظام قائم ہے۔ جس قوم اور جس سماج میں عدل و انصاف نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور دنیا میں اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔ قرآن پاک کتاب و نبوت کا مقصد ہی یہ بتاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان میزان قائم ہو۔ اور میزان سے مراد عدل و انصاف ہی کے قوانین ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ معاملات میں عدل و انصاف کو اور سچی کھری بات کہنے کو اپنا اصول اور نصب العین بنا لو۔ اور پوری دیانتداری اور

خدا ترسی کے ساتھ اس فرض کو ادا کرو خواہ اس سے تم کو یا تمہارے اعزا و اقربا کو کتنا ہی نقصان پہنچے، لیکن حق و انصاف کے معاملہ میں کسی کی جانب داری نہ کرو اور نہ کسی غریب کی غربت و ناداری پر ترس کھا کر اس کی بے جا حمایت کرو۔ انصاف اور سچائی سب سے مقدم ہے غریبوں کی غربت بھی اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ دیکھنے والا ہے اور وہی سب کا حقیقی والی ہے حتیٰ کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف سے معاملہ کرو۔ محض ان کی دشمنی کی بنا پر ان سے بے انصافی کا معاملہ روا نہ رکھا جائے اور ان کے حقوق پامال نہ کئے جائیں کیونکہ اسلام اسکی اجازت نہیں دیتا۔ اپنوں سے انصاف کی تلقین تو سب نے کی ہے لیکن یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے۔

امانت: سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل امانت بھی ہے امانت سے مراد محض اس قدر نہیں کہ کسی نے جو چیز کسی کے پاس رکھدی ہو وہ مطالبہ پر جوں کی توں واپس کردی جائے بلکہ تمام حقوق و فرائض کا دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا اور ہر قابل لحاظ بات کا لحاظ رکھنا بھی امانت کے مفہوم میں شامل ہے یہاں تک کہ کوئی شخص کسی معاملہ میں مشورہ لے تو پوری خیر خواہی سے مشورہ دینا اور اس سے متعلق تمام رازوں کو محفوظ رکھنا بھی امانت ہی ہے قرآن پاک میں امانت کے وصف کو اختیار کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

عفو و درگزر: مسلمان کو عفو و درگزر کی بھی تعلیم دی گئی ہے عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کی خطا اور قصور کو معاف کردیا جائے اور انتقام کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی بخش دیا جائے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال بھی پیش کردیا جائے اس سے تو شرپسند عناصر کی اور بھی ہمت افزائی ہوتی ہے عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے جب کہ غلطی کرنے والا کسی حد تک اپنی غلطی پہ نادم ہو۔ بعض لوگ عفو و درگزر کو اپنے رعب و عزت کی کمی کا باعث تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتقام سے فوری دھاک تو بیٹھ سکتی ہے مگر پائیدار عزت عفو و درگزر سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

رواداری: عفو و درگزر ہی سے ملتی جلتی ایک صفت رواداری ہے رواداری سے مراد یہ ہے کہ باہمی تعلقات میں خیر خواہی سے کام لیا جائے۔ اور دوسرے کی

معمولی غلطیوں اور خطاؤں کی گرفت نہ کی جائے رواداری کی بنا پر معاشرہ میں اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

احسان: اپنی نوعیت کے لحاظ سے عفو اور رواداری دراصل احسان کی مختلف شکلیں ہیں۔ احسان کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جو اس کیلئے سودمند ہو اور یہ برتاؤ عقلاً اور شرعاً صحیح ہو۔ احسان کی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً ضرورت مندوں اور رشتہ داروں کی مالی امداد کرنا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا کسی کے حق کو خوبی اور سخاوت سے ادا کرنا احسان کی یہ شکل فضل کہلاتی ہے یعنی کسی کے حق کو نہ صرف پورا کرنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ادا کرنا یا کسی سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے رعایت کرنا یا اس کو بالکل چھوڑ دینا پھر احسان صرف حقوق العباد کے ادا کرنے ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی یہ مطلوب ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ احسان اسے کہتے ہیں کہ سارے حقوق و فرائض اس طرح ادا کئے جائیں جیسا کہ ان کے ادا کرنے کا حق ہے

مساوات: معاشرتی محاسن میں مساوات کا بھی بڑا اونچا مقام ہے اسلام میں مساوات سے دو باتیں مراد ہیں ایک قانونی مساوات اور دوسرے معاشرتی مساوات۔ قانونی مساوات کے تحت تمام افراد ملت کے لیے ایک ہی قانون ہے غلام ہو یا آقا، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل سب کیلئے قانون کی پابندی یکساں ضروری ہے کسی کو کسی بنا پر کوئی برتری یا فوقیت حاصل نہیں پھر اسی قانونی مساوات سے مراد یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو ترقی کے خواہ وہ معاشی ہو یا علمی و معاشرتی یکساں مواقع حاصل ہوں معاشرتی مساوات سے مراد یہ ہے نشست و برخاست میں عبادات میں سماجی تقریبات میں یا عام اجتماعی زندگی میں کسی کو اولیت و فضیلت حاصل نہیں امیر و غریب مسجد میں شانہ بشانہ کھڑے ہونگے تقریبات میں ایک دوسرے سے قریب بیٹھیں گے دعوتوں میں ایک ہی پلیٹ سے کھائیں گے اسلام میں اونچ نیچ ہے نہ برتری و کمتری۔

اخوت: پھر اسلام صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ اونچ نیچ کے امتیازات کو صرف سلبی طور پر ختم کرے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایجابی طور اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اس لحاظ سے انکے تعلقات ایسے ہی ہونے بھی چاہئیں کہ جیسے بھائیوں کے ہوتے ہیں یعنی کہ ان میں باہم شفقت اور ترحم ہو اور آپس میں ان کا معاملہ نرمی اور قرو تنی کا ہو،

ہر ایک دوسرے کا خیرخواہ، خدمت گزار اور نیاز مند ہو اور جو چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی اور دلوں میں کدورت پیدا کرنے والی ہو سکتی ہیں مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان سب سے اجتناب کریں اخوت کے یہ تعلقات ایک جانب تو ملتِ اسلامیہ کو بحیثیت ایک قوم کے مستحکم کرتے ہیں اور دوسری جانب ایک پر امن اور صالح معاشرہ کے ضامن ہیں

تقویٰ: اخلاقی محاسن جن میں سے چند کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسلام کے نزدیک صرف اس صورت میں قابلِ ستائش ہیں جب ان سے خدا کی رضا مقصود ہو اگر اسکے علاوہ کوئی اور مقصود رہے تو ان محاسن کے بہتر معاشرتی اور سماجی نتائج تو یقیناً قوانین نفسیات و عمرانیات کے تحت نکلیں گے لیکن آخرت میں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا خوفِ خدا اسلامی اخلاقیات کی بنیاد ہے یہی خوفِ خدا جب انسان اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیتا ہے اور جب وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ کہیں یہ خدا کو ناپسند تو نہیں، تو اس کا یہ وصف تقویٰ کہلاتا ہے تقویٰ کے دو لوازم ہیں ایک تو یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں خدا کی مکمل اطاعت اور دوسرے اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے مزید نیکی کرنے کی مسلسل کوشش قرآن پاک میں جہاں تقویٰ و نیکی کی تعلیم دی گئی ہے وہیں متقی لوگوں کے لیے آخرت کی زندگی کی بشارت بھی سنا دی گئی۔ اس کے برخلاف وہ لوگ جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

قرآن و سنت میں جہاں پسندیدہ اخلاق کا ذکر ہے وہاں ناپسندیدہ اوصاف بھی گنا دئے گئے ہیں تاکہ انسان ان سے بچ کر اپنی آخرت کی زندگی بہتر بنا سکے۔

صفات مذمومہ

صفات محمودہ کی طرح صفات مذمومہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے، جن میں غرور و تکبر، بخل، عیب جوئی، چغل خوری، خیانت، جھوٹ، فحش کلامی، خود پسندی، شہرت طلبی، تنگ نظری، تنگ ظرفی، حرص و طمع، تصنع اور نقالی، اسراف و تکلف، مایوسی اور پست ہمتی، غیبت، کینہ، حسد، وعدہ خلافی، رشوت، فساد، نفاق، ذخیرہ اندوزی، حیلہ سازی، گروہی اور قبائلی عصبیت، احسان فراموشی اور غصب وغیرہ وغیرہ شامل ہیں ظاہر ہے کہ ان سب پر سیر حاصل بحث اس مختصر باب میں ممکن نہیں، صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حرص: حرص کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) دولت کا لالچ (۲) منصب و ریاست کی حرص اور شہرت کی حرص۔ اور ان سب میں دولت کا لالچ ایک عجیب بلا اور حیرت ناک بیماری ہے جو نفس انسانی کو ہر آرام و راحت سے محروم کر دیتی ہے اعصاب اور جسم (اور روح) تھک جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "زر اور مال" اور "دولت" کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان اور اُس کی خواہشوں کے درمیان قبر کی مٹی حائل نہیں ہو جاتی۔

دولت کی حرص آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے آنے والے معاشی خوشحالی کی وجہ سے جد و جہد ترک کر دیتے ہیں اور اگر وہ نااہل ہوئے تو خون جگر اور محنت و مشقت سے حاصل کردہ دولت کو ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے باپ دادا کا نام بدنام ہوتا ہے۔

حکومت و ریاست کی حرص کے راستے میں کتنے انسانوں کا خون بہایا گیا ہے اور کتنی عزتیں اس راہ میں روندی گئی ہیں اور کتنی آبادیاں ویران ہوئی ہیں ابتدائے آفرینش سے آج تک بیشتر بڑی جنگیں حکومت و ریاست کے حصول کے لیے لڑی گئی ہیں اور اس حرص کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے انسان جو کچھ حاصل کر لیتا ہے، ہر بار اس سے بلند تر منصب ریاست کے حصول کیلئے "جائز و ناجائز" کی تمیز کو ترک کر کے قدم اٹھاتا ہے کوئی عہدہ، پھر وزارت۔ پھر کسی مملکت کی فرماں روائی اور اس کے بعد ساری دنیا پر تصرف کی خواہش اور پھر معاذاللہ خدائی کی تمنا۔ "فرعونیت" اس کے سوا اور کیا ہے؟۔ ہر قسم کے ظلم، خوں ریزی، تکبر، نخوت اور ایسے ہی دوسرے عمل جو دین اور دیانت کی ضد ہیں، حرص ریاست سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے زمین پر فساد پیدا ہوتا ہے اور فساد پیدا کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا، جنت انہی کو ملے گی جو حرص ریاست میں مبتلا ہو کر اللہ کی زمین کو فساد کا گہوارہ نہیں بناتے۔

تلک الدار الاخرۃ نجعلھا	آخرت کا یہ گھر ہم انہی لوگوں کے لیے خاص رکھینگے
للذین لا یریدون علواً فی الارض	جو زمین میں اپنا اقتدار اور اپنی کبریائی نہیں چاہیں
ولا فسادا۔ (القصص۔ ۸۳)	گے اور نہ فساد۔

* جہاں سے اس باب کے اختتام کی پوری بحث آقائے سید محمد تقی شیرازی کی فارسی کتاب "سموم قتال" جلد اول سے ماخوذ ہے ترجمہ از سید ادیب کشفی

ظلم: "ظلم" ایک قبیح فعل ہے اور اس کی بنیاد انسانوں کو تکلیف دینے کا معکوس جذبہ ہے
دوسروں کو بلا سبب شرعی (یعنی قصاص، حد اور تعزیر کے جواز اور محل کے بغیر) قتل کرنا، مارنا اور
قید کرنا ہی ظلم نہیں ہے بلکہ ہر وہ فعل جس سے دوسروں کے حقوق پامال ہوں اور انکو بلا سبب صدمہ
یا تکلیف پہنچے ظلم ہے ظلم نے کتنے گھروں کو ویران کیا ہے، کتنے ہی خاندانوں اور نامیوں کے
نام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے اللہ تعالیٰ عادل مطلق ہے اور اُس کے انصاف کا تقاضہ صرف
یہی نہیں ہے کہ وہ خود ظلم نہ کرے بلکہ اُس کے انصاف پسے کراں کا ایک پہلو یہ بھی ہے
کہ وہ ہر ظلم کو اپنے "قانون مکافات عمل" کے تحت سزا دے اور ہر مظلوم کو ظالم سے
نجات دلائے، چنانچہ فرمایا ہے:

ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون - (سورۂ ابراهیم - ۴۲)

اے پیغمبر، یہ نہ سمجھئے کہ اللہ ظالموں کے عمل سے غافل ہے۔

وہ ظلم کو فراموش نہیں کرتا اور نہ غفلت برتتا ہے کوئی ظلم اسکے علم کی حد سے باہر نہیں ہے۔
ظلم وہی لوگ کرتے ہیں جو قدرت، قوت، ثروت، امارت اور ریاست حاصل کرنیکے بعد
خدا اور اُسکے قانون کو بھلا دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا کو پہچانتے ہیں اُسکے قہر اور انتقام سے
ڈرتے ہیں اُسکے قانون مکافات کو تسلیم کرتے ہیں اُسے ہمیشہ حاضر و ناظر جانتے ہیں وہ کبھی ظلم و
تعدی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بندگان خدا کے ساتھ چھوٹے سے چھوٹے
ظلم (حتیٰ کہ کلمہ بد) کو بھی خدا معاف نہیں کرتا۔

دروغ گوئی: جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے جو دروغ گو کو لوگوں کی نظروں
میں ذلیل و خوار بے منزلت اور بے اعتبار بناتا ہے جھوٹے کی گفتگو اور کردار پر
کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ احادیث میں جھوٹ کی بار بار اور شدت کے ساتھ مذمت
کی گئی ہے اور اس سے بڑی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے اور جھوٹ کو کفر کے
کنبہ کا ایک فرد قرار دیا گیا ہے۔

جھوٹ کا سلسلہ بہت طویل ہے دوکاندار جھوٹ بولتا ہے خریدار جھوٹ
بولتا ہے تعمیرات کا کام کرنے والے ٹھیکیدار جھوٹ بولتے ہیں اور خدا کے نام پر،

خدا کی جھوٹی قسمیں کھا کر دروغ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ جب تک جھوٹ کو اسکی تمام شکلوں میں ترک کر دیا جائے، معاشرہ میں امن وصلاح قائم نہیں ہو سکتے۔

غیبت: غیبت اصطلاح شروع میں یہ ہے کہ "کسی مسلمان کے بارے میں اس کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کہی جائے جسے اگر وہ سنتا تو آزردہ ہوتا اور اُسے بُرا معلوم ہوتا۔"

جو آیات اور بہت سی احادیث غیبت کے بارے میں موجود ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ غیبت ایک بڑا گناہ ہے اور اس کا عذاب بہت شدید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ۔ (الھمزۃ - ۱)

ہر ایسے شخص کیلئے بڑی خرابی ہے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو اور روبرو طعنہ دینے والا ہو

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ "ھماز مشاء بنمیم" ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والآخرۃ واللہ یعلم وانتم لا تعلمون - (النور - ۱۹)

یعنی جو لوگ ایمان والوں کے کسی بڑے کام کو فاش کرنے کو عزیز رکھتے ہیں اور اسے بیان کرتے ہیں ان کیلئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہیں ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

ان کے علاوہ اس ضمن کی دوسری آیات اور احادیث انسان کو اس گناہ کی اہمیت اور برائی سے آگاہ کرتی ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ:

الغیبۃ اشد من الزنا

غیبت زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے۔

مسلمان اور صاحب ایمان کا فرض ہے کہ اس گناہ کی شدت کے پیش نظر دوسروں کو غیبت سے روکے، چنانچہ صاحب معراج السعادۃ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی غیبت سنتا ہے اور اُس کی پیٹھ پیچھے ... کی حمایت نہیں کرتا، خدا اسے دنیا اور آخرت میں ذلیل کرے گا۔

ناپسندیدہ اخلاقی صفات کے اس بیان کے بعد ہم اپنی بحث کو ان چند حقوق و فرائض کے ذکر پر ختم کرتے ہیں۔ جو اجتماعی اخلاق کے نقطہ نظر سے بڑے اہم ہیں۔

حقوق و فرائض: ہمسایہ کے حق کی شرع اسلام میں اسقدر تاکید ہے کہ صادق مخبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "وہ ہم میں سے نہیں ہے جو اپنے ہمسایہ کے ساتھ نیکی نہ کرے" اس روایت کی مراد اور مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ہمسایہ کے ساتھ برائی نہ کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اسکے ساتھ نیکی کرے اگر وہ غریب ہے تو مالی مدد دے۔ اگر مظلوم ہے تو اسکا ساتھ دے اگر حاجت مند ہے تو اس کی پوری کرے اور اگر بیمار رہے تو اس کی عیادت کرے اگر ہمسایہ کوئی برائی کرے تو چشم پوشی کرے اور اسے معاف کر دے اور اگر ہمسایہ کا کوئی عیب معلوم ہو جائے تو اسکی تشہیر نہ کرے علاوہ بریں اگر ہمسایہ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے اور اس کی استطاعت میں ہو تو اسے دے۔

والدین پر اولاد کے حق ہیں ان میں سب سے اہم حق اسلام کے دستور اور آئین کے مطابق بچوں کی تربیت ہے اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ سات سال کی عمر سے انہیں باقاعدگی نماز کیطرف متوجہ کریں اور نماز اور دین کے اہم مسائل سے مختصر طور پر (آسان زبان میں) روشناس کرائیں بچوں کو جھوٹ چوری، گالی اور بدزبانی سے بطریق احسن روکیں اور ایسے اسکولوں میں داخل کرائیں جہاں اسلامی روح اور فضا موجود ہو اور ایسے اسکولوں میں ہرگز نہ بھیجیں جہاں آئین اسلام کے خلاف ہر عمل ہوتا ہو٭ بچپن اور لڑکپن کے نقوش بڑے گہرے ہوتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر بڑی خرابیاں پیدا ہونگی ایسے مدرسوں سے مسلمان زادے ذہنی طور پر کافر ہو جاتے ہیں اور ماں باپ بھی اولاد کے صالح ہونے کی تمنا کا خون ہوتا دیکھتے ہیں اور صالح اولاد کے اچھے نتائج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بھی اپنی اولاد کے گناہوں کے شریک سمجھے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ایسے غیر دینی ماحول میں اولاد راست گوئی امانت اور عفت سے دور ہو جائے گی۔ اور دیانت و دین داری ان تینوں صفتوں کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ایسے ہی غیر دینی مدرسوں کے طالب علم بڑے ہو کر اپنی قدرت اور اثر کو لوگوں کی دیانت سلب کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات آج ہم آگے دن اپنے معاشرہ میں دیکھتے ہیں۔

٭آج پاکستان کے نونہالوں کا مستقبل غیر مسلم اسکولوں میں جیسا کچھ بنایا جا رہا ہے اس کی داستان بڑی دردناک ہے پس حیا کرو؟ سوچئے

ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ کے لیے خدائے عزوجل نے حکم دیا ہے۔ اوراس سلسلے میں قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ:

انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم (الحجرات -۱) — مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح و صلاح کا رویہ رکھو۔

آپس میں محبت اس برادری کی بنیاد ہے "اصول کافی" میں ہے کہ صادق محمد نے فرمایا کہ "مومنین" دوسرے مومن کا بھائی ہے اس کی آنکھ ہے۔ اس کا رہنما ہے مومن، مومن کے ساتھ خیانت نہیں کرتا ظلم نہیں کرتا، جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ اس کی کسی جائز خواہش کو رد نہیں کرتا ""اصول کافی" کی ایک اور روایت کے مطابق "مومن، مومن کا بھائی ہے: اور مسلمان تن واحداور روح واحد کی حیثیت رکھتے ہیں مومن کی پہچان یہ ہے کہ اگر دوسرا مسلمان بھوکا ہو تو وہ کھانا نہ کھائے"

اسلام کے اخلاقی نظام کے جو اہم گوشے اس باب میں پیش کیے گئے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اخلاقی ضابطے ایک طرف تو افراد کی زندگی کو "خیر" کے قالب میں ڈھالتے ہیں اور دوسری طرف یہ افراد ایسے معاشرہ کو جنم دیتے ہیں جس کے اخلاقی معیار اضافی نہیں بلکہ غیر متبدل ہیں۔

انسانی ذہن اخلاق کے جو معیار وضع کرتا ہے وہ ادوار کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے بنائے ہوئے ضابطہ اخلاق پر سب کا متفق ہونا ممکن نہیں۔ اسلام نے اپنے اخلاقی نظام کے ذریعہ اسی مسئلہ کو انسانیت کے لیے سہل بنا دیا ہے*

اسلام کا معاشرتی نظام

"انسان ایک معاشرتی حیوان ہے یا یوں کہیے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے۔
اور اپنی فطرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے اور بغیر اجتماعیت کے اسکی زندگی
ناممکن ہے انسان اپنی پیدائش سے لیکر موت تک معاشرہ کا محتاج ہے اسکا جسم
عقل اور خلق جیسے اہم عطیات بھی "خالق کائنات" جماعتی علائق ہی کے لیے
عطا فرماتا ہے پھر دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔
اپنی پرورش کے لیے دوسرے لوگوں (ماں، باپ، بھائی بہن یا رشتہ داروں) کا محتاج
ہوتا ہے پھر ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے،
ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت و سیاست سے
واسطہ پڑتا ہے نیز "فرد" یا "انسان" اپنی ہر متعلقہ شے مثلاً خوراک، لباس،
مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبہ میں جماعت کا "دست نگر" ہے۔ اور اگر اس
سے وہ تمام علائق حذف کر دیئے جائیں۔ جو جماعت کی بدولت اسکو حاصل ہوتے
ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔
انسان کے اعمال، اغراض، اور عادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے
تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر ایک فرد یا انسان دوسروں
کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس لیے اس کو فطری طور پر مدنی
الطبع تسلیم کر لینے کی دلیل نہیں ہے چنانچہ جماعت کا وجود افراد جماعت پر موقوف ہے اور افراد
جماعت میں سے ہر فرد کا نفع و نقصان جماعت کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں
ایک دوسرے کے سہارے قائم ہیں چھوٹی جماعتوں سے لیکر بڑی جماعتوں تک ہر جگہ یہ تعلق موجود
ہے، مثلاً سب سے چھوٹی جماعت خاندان اور کنبہ ہے جو والدین، اولاد اور قریبی اعزہ سے بنتی ہے
اور جن میں باہمی اعتماد اور خدمت گذاری کا معاملہ رہتا ہے اس کی حیثیت بالکل انسانی جسم

کیطرح ہے کہ اگر ایک عضو کو مضرت پہنچ جاتی ہے تو تمام اعضاء تکلیف محسوس کرتے ہیں مثلاً ایک لڑکا بدطینت ہوجائے تو وہ سارے کنبہ کو سعادت وخوش بختی سے محروم کر دیتا ہے۔ یا اگر باپ شرابی یا جواری ہو تو اس کی یہ خصلت بد پورے کنبہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور تمام کنبہ کی معاشرت کو تنگ اور گھر کے پورے مالی و انتظامی نظام اور ماحول کو درہم برہم کر دیتی ہے پھر کنبہ سے بڑی جماعتوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے مثلاً "مدرسہ" جہاں طلبہ، مدرسین، اور عملہ ایک "جسم عضوی" ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے شخصی عمل سے مدرسہ کی عظمت ویستی کا باعث بن سکتا ہے۔ یہی حال ایک بڑی جماعت یا گروہ کا ہے کہ ایک ہی فرد کا کوئی نمایاں کام ساری "جماعت" یا "جرگہ" کی قدر وقیمت کو بڑھا دیتا ہے، اور ایک شخص کی ہی دناءت سے پوری جماعت یا جرگہ کی ذلت ورسوائی ہوجاتی ہے۔ مثل مشہور ہے "ایک مردہ مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"۔ پھر ان اجتماعی علاقوں میں ملت یا قوم ایک بڑا علاقہ ہے۔ جو دین یا زبان یا تمدن کے ذریعے وحدت کا داعی ہے اور اس راہ سے تمام افراد پر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے اور اس کے تمام افراد نفع ونقصان میں مشترک ہوتے ہیں۔ اور "ملت" جو جغرافیائی حدود سے بالا تر اور دین کے رشتہ سے انسانوں میں اخوت عام کے تعلق کو استوار کرتی ہے، اسکی وحدت اجتماعی تو اسقدر دورس ہے کہ اگر حقیقی وحدت اسی کو کہا جائے تو بجا ہے۔ جس طرح جسم کا عضو اس کو فائدہ یا نقصان پہنچاتا ہے، قوم اور امت کا جسم بھی اپنے افراد سے اسی طرح نفع ونقصان حاصل کرتا ہے۔ طلبہ، مدرسین، تاجر، کاشتکار، صنعت کار، بڑھئی وغیرہ سب قوم کے اجزا ہیں جو اس کے جسم سنوارتے ہیں تباتے ہیں اور قوم کے عضو کا ہر فرد قوم کے نفع ونقصان پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ اثر انسان کے اچھے اور برے اعمال کے مختلف درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اور قوم کی ترقی کا پیمانہ اسکے افراد کے، مجموعہ اعمال کے اعتبار سے ہی بنتا ہے اب اس سے آگے بڑھئے۔ "تمام عالم انسانی" جنس، رنگ روپ، بول چال، اور مذہب کے اختلاف کے باوجود

ایک ہی جسم عضوی "انسانیت" کے افراد و اعضاء ہیں اسی لیے ہر ایک قوم دوسری اقوام پر اثر ڈالتی ہے اور صنعت و حرفت تجارت اور معارف و علوم اور اخلاق میں ایکدوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہے اور اقوام کے درمیان خصائل و عادات کا طبعی اختلاف فی الحقیقت انکے درمیان الفت و محبت کرنے سے مانع نہیں ہے جسطرح ایک کنبہ کے افراد میں مرد و عورت کا تنوع ہونا ان کی یکتائی اور انکے جسم واحد ہونے کے منافی نہیں ہے۔

غرض معاشرے کے بے شمار روابط ہیں۔ جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں ان ہی کی درستی پر ایک ایک انسان کی، ایک ایک معاشرہ کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسانوں کو ان روابط کے لیے صحیح اور منصفانہ اور پائدار اصول و حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان، اسکی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بنا اور اس نے بزعم خود انصاف کرنا چاہا۔ تو پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف و راستی۔ اس لیے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لیے رجوع کر سکے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینی یا مذہب سے انحراف کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے اصول غیر مستقل اور روز بنتے یا ٹوٹتے ہیں۔ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشہ میں ظلم نا انصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانی معاملات میں انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خودغرضیاں اور انتشار رونما ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کے تعلق سے لیکر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہتا جس میں کجی نہ آگئی ہو۔

اسلام کا نظام معاشرت

٭ اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول و ضوابط مستقل و محکم ہیں۔ جس کا پورا مزاج عدل و انصاف سے مرکب ہے، اور جس کے تمام اجزا باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع و ہمہ گیر ہے۔۔

کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اسکے دائرہ میں آجاتی ہیں یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہے معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے اس لیے اسلام جہاں جماعتی اور معاشرتی اصلاح کرتا ہے وہیں فرد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کو نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے کیونکہ وہ معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے اور اسکی اصلاح معاشرہ کا سدھار ہے اس لیے اس کی نظر میں فرد اور سماج دونوں کی اصلاح و تربیت یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے وہ انسان کو محض نظام اجتماعی کا ایک بے جان اور معطل پرزہ یا ماحول کا ایک پرتو محض نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے معاشرہ کا انتہائی اہم جزء اور اصل "تاریخ ساز" قرار دیتا ہے وہ ایک طرف تو اس میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی پوری زندگی کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے خدا کے سامنے ہر فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے اور اس طرح خود معاشرہ میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشو و ارتقاء کا پورا پورا موقع ہونا چاہیئے۔

من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا۔ (حم سجدہ۔ ۴۷)	جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اس کے آگے آئیگی"۔

ایک حدیث میں انسان کی زندگی کو اس طرح ذمہ دار بنایا گیا۔

کلکم راع و کلکم مسئول رعیتہٖ	تم میں سے سب گلہ بان (ذمہ دار اور نگہبان) ہیں اور ہر ایک گلہ بان سے اسکے گلہ۔
(بخاری)	(ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

اور اس احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کے بعد دوسری طرف ضرورت اس امر کی ہے کہ بندے کا ایمان خدا، رسول، اور آخرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے اس سلسلے میں علم دین کی فراہمی سب سے اہم ہے چنانچہ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے حضور صلعم کو تو یہ دعا مستقل طور پر سکھائی گئی کہ:

وقل ربّ زدنی علماً۔ (طٰہٰ ۔ ۱۱۴)	اور کہئے (دعا کیجیے) کہ پروردگار میرے علم میں زیادتی فرما

اور خود حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ!

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم (ابن ماجہ) "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"
چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی معاملات کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے پھر علم دین کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ کے لیے ضروری ہے گویا اسلام ایک فرد کو ایسے خطوط پر چلانا چاہتا ہے جس پر اس کے استحکام اور عملی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے۔

علم دین کا ایک بڑا مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے اس لیے اسلام ہر فرد میں جذبہ عمل بیدار کرتا ہے اور سعی و جدوجہد کی اہمیت اس کے ذہن پر مرتسم کرتا ہے!
وان لیس للانسان الّا ما سعیٰ (النجم-۳۹) "انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جسکی وہ کوشش کرتا ہے"

نبی اکرم صلعم کا ارشاد ہے "جو کوشش کریگا اس کو اسکی کوشش کا پھل ملیگا اور ہر کوشش کرنیوالے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے" ایک حدیث میں ارشاد ہے "کوشش کرو اس لیے کہ اللہ نے تم پر کوشش کرنی فرض کی ہے"۔ جذبۂ عمل کو بیدار کرکے اسلام فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے۔ کیونکہ وہ ایمان جسکے نتیجہ میں اچھے اعمال (اعمال صالحہ) رونما نہ ہوں اس بیج کی طرح ہے جو بار آور نہ ہو سکے۔ آپ صلعم کا ارشاد ہے "ایمان، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کا نام ہے" اور "اللہ ایمان کو بغیر عمل قبول نہیں کرتا اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا"، گویا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں۔

فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں جیکا اسلام نے ایک مفصل پروگرام دیا ہے اور جس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں کیونکہ افراط و تفریط سے بچانا بھی اسلام کا ایک خاصہ ہے۔ اس کے نزدیک فرد کو نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیئے اور نہ راہب بن جانا چاہیئے، دنیا داری اور دنیا سے اجتناب دونوں سے بچنا ضروری ہے اس لیے اعتدال کی راہ سب سے بہتر ہے حضور (صلعم) کے الفاظ میں "ہر ایک کام میں اوسط درجہ (اعتدال کی راہ) بہتر ہے"۔ اسلام ہر فرد میں میانہ روی کی صفت ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر اسلام کی نظر میں چونکہ امت مسلمہ کو "امۃ وسط" اور "خیر امت" کہا گیا ہے اس اعتبار سے وہ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کرے، اور اپنی زندگی کا اصل مقصد دنیا کمانے کے بجائے دین کو قائم کرنے کے لیے وقف کر دے اور اس راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پڑے اسے پیش کرنے سے بالکل دریغ نہ کرے۔

سورۂ توبہ رکوع ۶ میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کی دعوت اور اعلائے کلمۃ الحق کیلئے

انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا — گھروں سے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری
باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ — ہو، اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے کوشش (جہاد) کر

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے قیام سے دنیا میں بھی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں اعتدال اور زندگی کی ضروریات کی پوری رعایت موجود ہے۔

یہ وہ موٹی موٹی باتیں ہیں جو ایک فرد کی اصلاح کے لیے اسلام کو مطلوب ہیں۔

معاشرتی اصلاح

* جیسا کہ پہلے کہا گیا، اسلام انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھی واضح ہدایت اور سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ اس کے نزدیک معاشرہ کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود فرد کی اصلاح۔ اس کے برعکس جدید مغربی تحریکات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض خارج میں تبدیلی کر کے نظام زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہیں انہوں نے فرد کو نظر انداز کیا۔ نتیجتاً ان کا اصلاحی پروگرام کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مشرق کے مذہبی نظاموں نے صرف فرد کی اصلاح کی اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے پروگرام بنائے لیکن اجتماعی زندگی کی درستگی سے بالکل صرف نظر کیا، اور نتائج کے اعتبار سے یہ نظام بھی ناکام رہے۔ لیکن اسلام دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔

عمومی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرہ کا طالب ہے۔ جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے پاک، تعصبات و مکروہات سے منزہ، نسل، رنگ، وطن، زبان

کی حدبندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے پرے، مساوات، اجتماعی عدل و انصاف اور ایک عالمگیر برادری پر قائم ہو اور ایک فکری، اخلاقی، نیز اصولی معاشرہ ہو جسکے افراد میں باہم ہمدردی، انسانیت اور مواساۃ کارشتہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

بنیادیں: ۱- اسلامی معاشرہ کی سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت اور سنگ بنیاد یہ ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے، رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک، قوم کی فطری تقسیم باہمی تعارف کے لیے ہے لیکن ان اختلافات کیوجہ سے تعصب یا تفریق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے۔ کیونکہ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے قرآن میں ہے:

یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وانثیٰ وجعلنٰکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔
(الحجرات - ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایکدوسرے کی شناخت کرسکو، تم میں سب سے زیادہ باعزت اور فضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساءً۔
(النساء - ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، وہ رب جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔

ایک حدیث میں ہے "لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے اور ہاں! عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر (بجز) تقوے کے" (کہ وہی وجہ امتیاز ہے) ایک دفعہ آپ (صلعم) نے ارشاد فرمایا "لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

توحید صرف نظام کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصور پیش نہیں کرتی بلکہ وحدت انسان کا تصور بھی اس کا لازمی نتیجہ ہے شان وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادہ کا فیض ہے انسان اسی کائنات کا جزو ہے جو دوسرے اجزا سے مربوط ہے فرداً فرداً نظام کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی باہم بھی ہم آہنگ اور مربوط ہو کر رہیں۔ اس بنا پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریہ کا قائل ہے کہ اس وحدت کے اگر اجزا مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق و اتحاد ہی کی خاطر اور متفرق ہیں تو اسی لیے کہ مجتمع ہو سکیں۔ مختلف راہیں اختیار کر کے ایک دوسرے سے تعاون سب کی منزل مقصود ہے، غرض، انسان بحیثیت ایک نوع بھی وحدت ہے اور بحیثیت فردی

اسلام کے اس تصور انسانیت کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ تمام انسان صاحب عزوشرف ہیں اور سب کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس لیے نہ تو یہ جائز ہے کہ کسی کو ہدف تعریض بنالیا جائے نہ کسی قسم کا لونی، نسلی، باطل ہو جاتا ہے ہر قسم کی عصبیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے ہاں آدمی کو بزرگی صرف اس وجہ سے حاصل ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔

انما المومنون اخوۃ۔ (الحجرات - ۱۳)

وہ لوگ جو مومن (اللہ پر ایمان رکھنے والے) ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لاتفرقوا - (آل عمران - ۱۰۳)

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

ایک حدیث میں ہے: "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسے دیوار (یا بنیاد) کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے۔ تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا کہ جیسے بدن (کہ) ایک عضو بدن کا مریض ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور درد و کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے شریک (مبتلا) ہو جاتے ہیں۔"

اسطرح ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرنیوالے اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں۔ جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد ہی یہ عقیدہ و ضابطہ ہوتی ہے جو انہیں تسلیم کرے تو وہ خواہ کسی نسل، کسی ملک، کسی رنگ، کسی وطن کا ہو اس معاشرہ میں شامل ہوگا جس میں سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہونگے پھر یہ معاشرہ جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اسکی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرہ میں نہیں لیتا مگر انسانی برادری کا تعلق انکے ساتھ قائم کرتے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے میں اسے کوئی تکلیف نہیں۔ ان کا علیحدہ معاشرہ بن جاتا ہے۔

۳۔ عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے اور دونوں کے ایکدوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں۔ اور خاندان کے نظام میں مرد کی حیثیت قوام اور نگراں کی ہے عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بہن کا رشتہ ہے اور وہ ایکدوسرے کے لیے اس طرح حرام ہیں جس طرح سگے بھائی بہن۔ لیکن نکاح وہ طریقہ (یا معاہدہ) ہے جس سے یہ ایکدوسرے کے شریک زندگی ہو سکتے ہیں اور یہی وہ جائز اور صحت مند رشتہ ہے جسکے ذریعہ یہ ایکدوسرے کے لیے حلال ہو سکتے ہیں۔ اس رشتہ سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

۴۔ معاشرہ کی عام فضا خیر خواہی، تعاون، امداد، اشتراک عمل، مواساۃ، ایثار اور بھائی چارہ کی ہونی چاہئے۔ لوگ جب آپس میں ملیں تو ایکدوسرے پر سلامتی بھیجیں۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لیے وہی چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ ظلم، غیبت، چغل خوری، کنبہ پروری، سوء ظن، دھوکہ دہی، برا نام رکھنے، رشک، حسد، بغض، تجسس، الزام تراشی، بے حرمتی و بے عزتی کرنے اور بے جا حرف گیری وغیرہ سب سے پرہیز کریں۔ نیکیوں میں ایکدوسرے سے تعاون کریں بلکہ سبقت لیجانے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایکدوسرے کو روکیں چنانچہ قرآن کا حکم ہے کہ:

وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ (المائدۃ ۲)

بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایکدوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور گناہ کی باتوں میں ہرگز باہمی امداد و تعاون نہ کرو۔

اور سورۂ قصص رکوع ۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ:

واحسن کما احسن اللہ الیک و لا تبغ الفساد فی الارض -	لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں طالب فساد نہ ہو۔
یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیراً منھم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیراً منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب - الحجرات - ۱۱)	مومنو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے (مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا نام بگاڑو

آگے ارشاد ہوا ہے کہ:-

ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً -	اور ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے

اسی طرح حدیث میں ہے کہ "الدین نصیحۃ" (دین تو خیر خواہی کا نام ہے) "مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں" (نقصان نہ اٹھائیں) "مسلمان کبھی طعنہ دینے والا گالی بکنے والا نہیں ہو سکتا" وغیرہ - گویا اسلام معاشرہ کی عام فضا کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے اور اس کی نظر میں زندگی تعاون، ہمدردی اور مواساۃ کا نام ہے -

۵- جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انفرادی طور پر انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اسلام انہیں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی پیدا کرتا ہے اور معاشرہ میں یہ احساس بیدار کرتا ہے۔ کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا، برائیوں کو روکنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہو۔ ایسی انفرادیت جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے نا آشنا بھی ہو، اسلام کو مطلوب نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق "وہ مسلمان جو لوگوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ گھل مل کر نہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے -" "تم میں سے ہر شخص

راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائیگا پس امام حاکم ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس کی جائیگی اور ہر شخص اپنے اہل وعیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائیگا اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور اس سے اسکی رعیت کے متعلق پوچھا جائیگا - اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی"

ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے جس میں بھائی بھائی کے حقوق، اہل خانہ کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق نیز غیر مسلموں اور عام انسانوں کے حقوق حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے حقوق تک کو واضح اور متعین کر دیا ہے تاکہ انسان محض جذبات کی رو سے یہ کرنا انصافی کا مرتکب نہ ہو اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قائم اور ارتقا پذیر رہے -

اسلامی نظام معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرہ میں یگانگت اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لیے مقرر کیے ہیں - اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قائم کئے ہیں جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے -

(الف) خاندان : یہ انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے - اس لیے اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے خاندان کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے مستحکم معاہدہ (نکاح) کے ذریعے وجود میں آتی ہے - یہ نکاح ایک ایسا باحرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بدترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے - معاہدۂ نکاح کے ذریعے دونوں (مرد عورت) اپنے اپنے اور بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے پابند ہو جاتے ہیں - اسی رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت بنتی ہے مرد اس کا نگراں اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے

وہ اپنے اہل وعیال کی دنیوی ضرورتوں اور آخروی فلاح دونوں کا خیال رکھنے والا ہے جس کیلئے وہ جواب دہ ہے اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم ونسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اسکی ذمہ داری یہ ہے کہ نہ صرف گھر کے اندرونی نظم ونسق کو سنبھالے بلکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کرے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے۔

پھر عورت اور مرد کے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے پھر اس سے رشتے کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی رشتے پھیلتے پھیلتے ایک معاشرہ تک جا پہنچتے ہیں نیز خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت، ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے گویا یہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اخلاق حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے بچے میں اسلام کا احترام پیدا ہو۔ اور اس کی سیرت اسلامی سانچے میں ڈھل جائے۔

(ب) قرابت: خاندان کے بعد رشتہ داری کی سرحد ہے جسکا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے جو لوگ ماں یا باپ کے تعلق سے یا بھائی بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایکدوسرے کے رشتہ دار ہوں۔ اسلام ان سب کو ایکدوسرے کا ہمدرد مددگار اور غم گسار دیکھنا چاہتا ہے قرآن میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں صلۂ رحمی کی بار بار تاکید کے ساتھ اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائیگا اور رشتہ یا قبیلہ کی عصبیت یا بیجا طرفداری سے کام لیا جائے خون کے رشتوں کو اسلام نے قائم رکھا ہے اور وراثت کے قانون کے ذریعہ انہیں ایک مستقل مقام دے کر محبت سے فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے

(ج) محلہ: رشتہ داری (قرابت) کے بعد ہمسائیگی ہے قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں، مثلاً "مجھے ہمسایہ کے

حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ ہمیں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (یعنی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا"۔ "وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اسکی شرارتوں سے امن میں نہ ہو" "وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اسکا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے"۔ غرض اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد مددگار، اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں، اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ اور ایسی معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی برسوں ایک دوسرے سے نا آشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں، اسلام کو مطلوب نہیں وہ ہر محلہ کو معاشرہ کا ایک فعال اور موثر جزو مانتا ہے۔

(د) مسجد: معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارہ کی سی ہے اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے اس سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے تاکہ مطلوبہ نتائج پوری طرح حاصل ہو سکیں۔

(ہ) احترام روایات: مسلم معاشرہ کی روایات صحیحہ (عرف) کا احترام اور ان کا استحکام بھی معاشرتی پالیسی کا ایک جزو ہے کیونکہ اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے نہیں کٹتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی بنا پر ان میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ تبدیلی مسلسل اور خاموش ارتقاء کے ذریعے ہوتی ہے۔ کسی ہیجانی اور غیر معمولی بغاوت یا ماضی سے انقطاع کے ذریعے نہیں۔

(و) نظام تعلیم: معاشرہ کے سدھار، اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظام زندگی کو نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے میں نظام تعلیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسلامی معاشرت کا ایک بہت بڑا ستون ہے۔

(ز) حدود و تعزیرات: معاشرہ کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود و تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ہے۔ جن کے ذریعہ معاشرہ کو ان افراد

سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی ، ترغیبی ، اور اخلاقی ذرائع سے اصلاح نہ قبول کریں ۔ اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں ۔ ایسے لوگوں کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے ۔ تاکہ معاشرہ ان کی فتنہ انگیزیوں سے امن میں رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہونے پائے ۔ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا جا سکے ۔ گو کہ ایک اسلامی معاشرہ میں یہ جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ہونگے اس لیے ان سزاؤں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ہی ہوگا ۔ لیکن بہر حال قانون کی گرفت اسلام میں ناقابل شکست ہے اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوتا ۔ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے ۔ ادنچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ حکمران وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بیکس فقیر ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالا دستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ " اگر محمد (صلعم) کی بیٹی فاطمہ رض بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا " (بخاری)

اسلام کا سیاسی نظام

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں۔ ان میں ریاست کا ادارہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں۔ اور اسے قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں دوسرے الفاظ میں!

"ریاست ایک منظم سماج کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے جبکہ ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دوگونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اطاعت کے امر واقع کا ہونا اس بات کو کافی ہے کہ ریاست موجود ہو گئی ہے۔"

اجتماعی زندگی کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لیے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کی ضرورت پہلے ہی قدم پر محسوس ہوتی ہے، ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات، معاشی لین دین، تمدنی معاملات کی استواری کا نگراں و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشو و ارتقاء کے لیے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن و امان قائم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کر دے جو وہ خود حاصل نہیں کر سکتا۔ دفاع، قیام نظم و قانون حصول عدل، تعلیم وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی تشکیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت محسوس کر لیا تھا۔ اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے اور دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نت نئی پیچیدگیوں کے راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کار برابر بڑھ رہا ہے، اس کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قوت اور

وسائل میں ترقی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن وامان اور نظم وضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے ریاست کا ادارہ ایک مثبت ادارہ ہے جو زندگی کے سب ہی شعبوں کو متاثر کرتا ہے اس کے قیام وارتقاء میں انسان کی اخلاقی حس اور تصور عدل کا غیر معمولی دخل رہا ہے۔ انصاف وہ محور ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر پرزہ حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ ریاست اگر معاشی تعلقات کو ترتیب دیتی ہے۔ تو اس لیے کہ عدل قائم ہو۔ قوانین بناتی یا بدلتی ہے تو اس لیے کہ وہ اصول انصاف سے زیادہ سے زیادہ مطابقت اختیار کر سکیں۔ اخلاقی احساس کا غلبہ اس ذریعہ ہے۔ کہ اگر خود غرض عناصر اپنے مفاد کی بنا پر قانون بناتے ہیں تو ان پر بھی اصول اخلاق وانصاف ہی کا جامہ پہنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی آئین مملکت نے کوئی ایسی شکل اختیار کی ہے۔ جو قوم کی چشم اخلاق میں کھٹکتی ہو تو جلد یا بدیر انقلاب واقع ہوا۔ اور ریاست کی بنیاد ہل گئی۔ نیز استحکام اور صحت مند ارتقاء اسوقت حاصل ہوا ہے جب آئین وقانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق تھے۔

اسلام اخلاق وسیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اس کے نظام فکر وعمل میں اس جاہلانہ تصور کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ دین وسیاست دو جدا چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے۔ اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطہ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لیے ہدایت دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر ہدایت کا نام شریعت ہے قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم پوری شریعت کا اتباع کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔
(البقرۃ - ۲۰۸)

اہل کتاب جن احکام خداوندی کو اپنی خواہش و پسند کے مطابق پاتے، ان پر تو عمل پیرا ہو جاتے لیکن جو احکام الہٰی ان کی خواہش و پسند کے مطابق نہ ہوتے ان سے کنی کترا جاتے، اس بنا پر ان کو خدا کی جانب سے تہدید کی گئی کہ:

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ (البقرۃ - ۸۵)	کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو تو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟

پھر اس روش کی بابت اس ہلاکت خیز سزا کا اعلان فرمایا:

فما جزاء من یفعل ذٰلک منکم الا خزی فی الدنیا۔ ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب۔ (البقرۃ - ۸۵) (البقرۃ - ۸۵)	پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا۔ اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و نامرادی کے اور کیا ہو سکتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

ان احکام کے بعد زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام کے دائرہ سے باہر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لیے ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی۔

یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ۔ (الاعراف - ۶۵)	اے برادران قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔
ان الحکم الا للہ۔ (یوسف - ۴۰)	(سن رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کے لیے نہیں۔
الا لہ الخلق والامر۔ (الاعراف - ۵۴)	خبردار! تخلیق (کی کارفرمائی) اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لیے ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کی حاکمیت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا:

فاتقوا اللہ واطیعون۔ (الشعراء - ۱۶۳) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست وسیاست کی اصلاح اسکے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خود خالق ارض و سماوات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔ (بنی اسرائیل - ۸۰)

اور (اے نبی) دعا کرو! اے پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لیجا سچائی کے ساتھ لیجا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اے اللہ! یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس طاقت سے میں دنیا کے بگاڑ کو درست کر سکوں، برائیوں کے سیلاب کو روک سکوں، نیکیوں کو قائم کر سکوں۔ اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ اس آیت کی یہی تفسیر حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے!

۱۔ ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جنکا سد باب قرآن سے نہیں کرتا

الاسلام والسلطان اخوان توامان لا یصلح واحد منهما الا بصاحب فالاسلام اس والسلطان حارس وما لا اس له یهدم وما لا حارس له ضائع ۔ (کنز العمال)

اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی اور حکومت گویا اسکی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جسکا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

- - -

اسلام ایک قانون شہادت دیتا ہے۔ اسکا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے وہ تجارت اور معاملات کے لیے قانونی ہدایت دیتا ہے وہ نکاح و طلاق، وراثت و وصیت، بیع و ہبہ کے لیے قوانین دیتا ہے اگر حکومت و اقتدار اسکو حاصل نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل، بیکار اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلعم نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔

٭ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الہٰی کا قائم کرنا اور دنیا میں آسمانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنے کے لائق ہے کہ حکومت الہٰی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی سب کوششیں کوہ کندن و کاہ برآوردن ثابت ہوں گی صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی۔ لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے یہی وہ نقشہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور تا مدت تک اسلام کی ترقی کا ضامن یہی نظام عمل ہو سکتا ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں۔ اسی طرح اسلام اکثر مذاہب کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ زمانے کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے

ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد، معیار، زاویۂ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق ہو، اس کے صحیح نمائندے دنیا کے لیے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر و للہ عاقبۃ الامور۔ (الحج - ۴۱)	یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کر دیں گے ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گیا کہ:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر۔ (آل عمران - ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کیلئے میدان میں لائی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اور قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر۔ (آل عمران - ۱۰۴)	تمہیں ایک ایسی امت بنی چاہئے جو بھلائی کی طرف دعوت دیتی رہے۔ نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے امر (حکم) اور نہی (ممانعت) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور تحکم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کی درخواست عرض کریں گے اور برائی سے باز رہنے کی التجا کریں گے۔ پس امر و نہی کے لیے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔ صحیحین کی مشہور حدیث ہے:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع، فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذالك اضعف الايمان۔	تم میں سے جو شخص کوئی بدی دیکھے اسکو ہاتھ سے (یعنی) بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے، تو زبان سے روکے۔ اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے*

ظاہر ہے کہ "تغییر بالید" (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لیے قوت و اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لیے بھی کچھ قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے اگر یہ کچھ نہیں تو تیسرے درجے پر قناعت کرنی پڑے گی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد بعض روایات کے مطابق "ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا"۔ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں بدی کو دل سے برا سمجھنا اور زشت و نیک کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سربلندی کے لیے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بتائے ہوئے مقاصد حیات کے لیے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں، جو ریاست اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا خود پاکستان کے قیام کی جد و جہد بھی مسلمانوں کے اسی احساس کا نتیجہ تھی۔ کہ ان کی ایسی ریاست ہونی چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد و تصورات اور اپنے قانون حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزار سکیں۔

فقہ کے بنیادی مسئلہ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی فکر کے تمام مکاتیب خیال اس امر پر متفق ہیں۔ کہ ملت اسلامیہ کے لیے نصب امامت لازمی ہے۔

---

* یعنی بخاری اور مسلم۔

خلیفہ اور امام کا تقرر واجب ہے کیونکہ نظم ملت، قیام امن حصول نفع و دفع ضرر، نفاذ احکام شریعت امامت و خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں، علامہ ابن حزم اپنی کتاب "الفصل بین الملل والنحل" میں لکھتے ہیں۔

اتفق جمیع اھل السنۃ وجمیع المرجئۃ و جمیع الشیعۃ وجمیع الخوارج علی وجوب الامامۃ وان الامامۃ واجب علیھا الانقیاد لامام عادل یقیم احکام اللہ ویسوسھم باحکام الشریعۃ التی اتی بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم *

کل اہل سنت مرجۂ، شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق انکا سیاسی نظام قائم کرے۔ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

اور شاہ ولی اللہ رح رقمطراز ہیں:

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے" +

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں اختلاف اگر ہے تو تقرر و انتخاب کی تفاصیل و جزئیات پر یا اسکے طریق و شرائط میں ہے لیکن نصب امامت کے وجود پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ سب کی نگاہ میں لازمی اور ضروری ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لیے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

(۳) اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے ریاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے۔

---

* ابن حزم، الفصل، جلد چہارم صفحہ ۸۷

+ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء مقصد اول، فصل اول

(۴) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الٰہی کو تو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے خواہ خواہش و نفس کی اندرونی وحشت کی بنا پر یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بنا پر

(۵) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظالم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور ان کے نتیجہ میں "چنگیزی" رونما ہوتی ہے ؎ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصہ پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ اسلام جو ریاست قائم کرتا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ دنیا کے دوسرے سیاسی نظاموں سے کس حد تک مختلف ہے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

(۱) اصولی اور نظریاتی ریاست: اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے، اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر، نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق۔ اس ریاست کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی علمبردار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لیے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے، اور اس سرزمین کی حفاظت اور اس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود ہر لمحہ اس کے سامنے رہتی ہے لیکن اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے اور ایک ایسے اصول کی داعی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے

؎ جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (اقبال)

سورۂ حج کی وہ آیت گزر چکی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ۔

"یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہونگے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے۔" (الحج - ۴۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیه باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ و رسلہ بالغیب (الحدید ۲۵)	ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت وجبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لیے بہت فوائد بھی ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کے دین کی اور اس کے رسول کی بن دیکھے مدد کرتا ہے۔

اسی طرح سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنًا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا ومن کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واطیعوا الرسول لعلکم ترحمون (النور:۔ ۵۵-۵۶)	تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انکو زمین میں حکومت عطا فرمائیگا جیسا کہ ان سے پہلے لوگ انکو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اسکو ان کے لیے قوت دیگا۔ اور خوف وہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو اسکے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ فاسق ہیں اور (اے مسلمانو) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ کی ادائی کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق انصاف قائم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے اور اسکی اصل غرض ان اصول کی سربلندی ہے جسے قائم کرنے کے لیے یہ وجود میں لائی جاتی ہے۔

اسلام میں قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے ریاست کلی اختیارات کی حامل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے اور اس کی پابند و ماتحت ہے اس میں اصول اطاعت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہر اطاعت پر بلند و بالا ہے۔ ہر شخص کی بنیادی وفاداری شریعت سے ہے ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی وفادار ہے اور اگر وہ ان کی بے وفائی کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

یا ایها الذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوه الی الله والرسول ان کنتم تومنون بالله والیوم الآخر (النساء - ۵۹)	اے ایمان لانے والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کیطرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت ربانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

۱- اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز و محور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں صرف اس صورت میں قابل قبول ہونگی جبکہ وہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت اور تابع ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:۔

لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔	خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔

۲- مسلمانوں کے اولی الامر یعنی وہ اصحاب اقتدار جنہیں فیصلہ کن اختیارات حاصل اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں، مسلمانوں ہی میں سے ہونے

چاہئیں۔ "منکم" (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے اس لیے اسلامی ریاست کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔*

۲- اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرمانبرداری مسلمانوں پر ضروری کی گئی تاکہ زندگی کا نظام بحسن و خوبی چلے اور بے وجہ اس میں اختلال واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی یہ اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیئے اور نہ ماننا چاہیئے" (بخاری و مسلم)

* اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسطرح تو ہم غیر مسلموں کے ساتھ امتیاز برتیں گے لیکن یہ اعتراض اس حقیقت کو نہ سمجھنے پر ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی و نظریاتی ریاست ہے اور اسکا مقابلہ محض قومی ریاست سے نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی اصولی ریاست اپنا سربراہ اس شخص کو نہیں بنا سکتی جو اس اصول پر ایمان ہی نہ رکھتا ہو۔ یہ بات اتنی صاف اور واضح ہے کہ آج کی مغربی دنیا بھی اسے محسوس کر رہی ہے ایک اشتراکی ریاست کا سربراہ ایک غیر اشتراکی نہیں ہو سکتا ایک فاشسٹ ریاست کا صدر ایک اشتراکی نہیں بن سکتا حتی کہ جمہوری ممالک بھی یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا ان حضرات کو جو جمہوریت پر یقین نہ رکھتے ہوں برسر اقتدار لایا جا سکتا ہے؟ کینیا میں الیکشن کے ذریعہ ان اشتراکیوں کی کامیابی نے اس مسئلہ کو پیدا کیا اور اسپر برطانوی پارلیمنٹ سے لیکر سیاسی مفکرین تک یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ جمہوریت اس کو گوارا نہیں کر سکتی (ملاحظہ ہو برٹرینڈ رسل کا مضمون در مانچسٹر گارڈین ۱۳- اکتوبر ۱۹۵۳) ڈیلی ٹیلیگراف لندن کا سیاسی مبصر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے "ہم اشتراکی پارٹی کو اقتدار کے لیے جدوجہد کی آزادی اس لیے دیتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ اسکی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اگر اسکی کامیابی کا کوئی بھی امکان پیدا ہو جائے تو ہماری سیاسی جبلت ہمیں فوراً یہ سوچنے پر مجبور کر دیگی کہ ہم اپنے جمہوری مفروضوں کو بدلیں اشتراکیت امریکی و برطانوی جمہوری روایت کو اس بری طرح تہ و بالا کر دیتی ہے کہ اشتراکیوں کی انتخابی فتح کو بھی جمہوری قرار دینا نہایت کھلے کھلے ارتداد کے مترادف ہوگا" (ملاحظہ ہو پیریگرین ورس تھارن کا مضمون "جمہوریت بنام آزادی" مطبوعہ ٹوینٹیتھ سنچری لندن جنوری سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۳)

پھر مغربی ممالک کے دساتیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی وہ خود مذہبی اور دوسری بنیادوں پر شہریوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں اور اسے جمہوریت کے منافی نہیں سمجھتے۔ انگلستان

ہم سا اولی الامر سے یکسٹ وفا اگرہ ان سے اختلاف انسان پر تنقید و محاسبہ کی اجازت اور ضمانت بھی یہ آیت دیتی ہے ہمیں حق دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف کریں اور بالآخر فیصلہ صرف خدا اور اسکے رسول کے احکام کے مطابق ہو۔ لیکن یہ تنقید اور اختلاف حدود قانون میں رہتے ہوئے ہونا چاہیئے۔ حضور (صلعم) نے فرمایا ہے:۔

"تم پر ایسے لوگوں بھی حکومت کریں گے جنکی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے انکے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا" (مسلم)

یہ اصول وفاداری اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اسکا مقصد ایک نظریہ کو سربلند کرنا ہے اس میں اطاعت ایک اصول کی ہے محض اقتدار کی نہیں۔

اسلامی ریاست کے اصولی اور نظریاتی ہونے سے چند امور پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

(الف) اسلام میں ریاست خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اس طرح یہ داشمست ریاست سے بالکل مختلف ہے جہاں ریاست خود مقصد بن جاتی ہے میں سربراہ ملک کے لیے پروٹسٹنٹ فرقہ میں بھی انگریزی کلیسا کا عیسائی ہونا ضروری ہے۔ آئرلینڈ میں صدر کے لیے کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ ارجنٹائن کے دستور کی رو سے صدر یا نائب صدر صرف کیتھولک عیسائی ہو سکتا ہے۔ ڈنمارک میں بادشاہ کے لیے صرف عیسائی ہی نہیں بلکہ ایونجلیکل چرچ (ایک خاص فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری ہے ناروے میں بھی بادشاہ کے لیے ایونجلیکل ہونا ضروری ہے یہی قانون سویڈن کا ہے جہاں بادشاہ کے ساتھ اسٹیٹ کونسل کے ارکان کے لیے بھی ایونجلیکل ہونا ضروری ہے یونان میں بادشاہ کے لیے مشرقی مسیحی کلیسا کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ اسپین میں صدر مملکت کے لیے رومن کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ تھائی لینڈ کے دستور میں صراحت ہے کہ اس کا سربراہ لازماً بدھ مت کا پیرو ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ریاستیں جو بظاہر نظریاتی ریاستیں نہیں ہیں اور اپنے کو لامذہبی (سیکولر) کہتی ہیں اولی الامر کے لیے ایک خاص مذہب (حتی کہ فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست جو ہے ہی ایک نظریاتی ریاست اور اس بات کا صاف اعلان بھی کرتی ہے کہ وہ ایک اصولی ریاست ہے یہ کیسے گوارہ کر سکتی ہے کہ اس کے کلیدی مناصب ان افراد کے ہاتھوں میں ہوں جو اس اصول ہی کو نہیں مانتے۔

اور فرد کی کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رہتی۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو وہ مواقع فراہم کرنا ہے جن کے ذریعہ وہ خدا اور اسکے رسول کے احکام کو پورا کر سکیں یہ ریاست خود اس بالاتر قانون کی تابع ہے یہی وجہ ہے کہ خود رسول (صلعم) یہ فرماتے ہیں کہ "اول المسلمین" (میں اطاعت الٰہی کرنے والوں میں سب سے پہلا ہوں) اور اسلام کا قانون سربراہ مملکت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح ایک عام شہری پر۔

(ب) اسلامی ریاست ایک لادینی قومی ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے لادینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات اور مسلک کو مذہب اور الہامی ہدایت پر مبنی کرنے کی بجائے محض عقل و مصلحت سے اپنا کام چلاتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالفت بھی ایسی ریاست اسلام کی بالکل ضد ہے اسلام دنیاوی معاملات کی اصلاح چاہتا ہے لیکن خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ اس کی روشنی میں یہ کام انجام دینا چاہتا ہے۔

اسلام اور لادینی ریاست:۔

آج چونکہ لادینی ریاست کا چلن ہے اس لیے اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے وہاں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعہ جن مظالم کو سند جواز دی گئی انہوں نے ایک ردعمل پیدا کیا۔ عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی پیدا ہوئی کہ خود مذہب ہی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لادینی ریاست تھی۔

سیکولرزم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۴۲ء میں ہوا جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کی یہ تحریک قائم کی۔ اس تحریک کی سربراہی اہل فکر و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہو گئی۔ مختصراً اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہئیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہئیے شروع میں بات صرف مذہب کے معاملہ میں غیر جانبداری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالف اور جارحانہ مادیت یا اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب میں لادینیت کے جو اثرات رونما ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) سیکولرزم نے تشکیک اور ذہنی پراگندگی کو پیدا کیا ہے۔ کوئی ایک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک قسم کی بے عقیدگی انسان میں پھیل گئی ہے۔ یہ اسی ذہنی انتشار اور فکری تشتت ہی کا نتیجہ ہے۔ کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی انتہا کی طرف لے گئیں۔

اشتراکیت کا مشہور نقاد آر۔ این۔ کریو ہنٹ لکھتا ہے۔

"اشتراکیت غربت و افلاس اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے اس لیے کہ اس کی اصلی کشش پچھلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلے میں اچھی تنخواہ والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لیے ہے یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خباثتوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے حقیقت یہ ہے اور آخری تجزیہ ہمیں اسی نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعہ کا نام ہے جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلاء کو پر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے جو کچھ دوسرے اصولوں کا علمبردار ہو۔"[۱]

اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں گئے وہ ذہنی بے اطمینانی، روحانی اضطراب، جذباتی تلون اور بے عقیدگی کا شکار ہوئے ہیں۔

(۲) فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض و خواہشات کی تکمیل رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطہ اخلاق ملکی اور قومی زندگی کے لیے باقی نہ رہا۔ نتیجتاً اس صدی نے دو ایسی ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی مقتولین و مجروحین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

(۳) اس کے عام اخلاقی اثرات بھی تباہ کن تھے۔ مستقل مزاجی، پامردی، جرأت اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا۔ اور مادیت، مصلحت بینی اور ابن الوقتی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے اس کے نتیجہ میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں۔

جو معاشرہ کو سکون و اطمینان سے محروم کئے ہوئے ہیں۔

(۴) تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو، تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا، ارنلڈ ٹائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

"یہ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصدِ زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجہ کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے" ؎

(۵) پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم عملاً ناکام ہی نہیں رہا ہے بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے نکل چکی ہے اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو سیکولرزم آج ایک دقیانوسی اور از کار رفتہ تصور ہے اور گردش ایام کے اس کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں، سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک مخصوص فضا ہی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں، تو اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

سیکولرزم، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، اس نظام کو کہتے ہیں۔ جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کا داعی ہے۔

انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سیکولرزم، انفرادیت، قومیت اور معاشی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سیکولرزم اسوقت کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب ریاست صرف ایک دفاعی ادارہ (پولیس اسٹیٹ) ہو جس کی ذمہ داری محض تنظم و نسق کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملہ اور اندرونی بدامنی سے بچانا ہو۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو پوری پوری آزادی

دی جا سکتی ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے۔ زندگی گزارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم از کم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کو روا رکھ سکتی ہے۔ اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا۔ لیکن آج ریاست کا تصور بدل گیا ہے۔ آج ریاست محض ایک عظیم الشان بت نہیں، آج یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ ایک خاص دائرہ کو چھوڑ کر ملک میں جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ ریاست عدم مداخلت پر کاربند رہے گی۔ آج اس کے وظائف نہایت عظیم اور اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ کی صورت گری کرتی ہے۔ اور اپنی پالیسی کے ذریعے اس کی ضابطہ بندی کرتی ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ جہالت کو ختم کرے۔ اور علم کی شمعیں روشن کرے، غربت کو ختم کرے۔ اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کرے، سماجی برائیوں کا قلع قمع کرے۔ اور شہریوں کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بندوبست کرے۔ بیماروں کا علاج، مظلوموں کی داد رسی، مجبوروں کی مدد و اعانت کا اہتمام کرے۔ مختصراً، آج کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے۔ اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے۔ کہ وہ نظریاتی غیر جانبداری برت سکے۔ اسے تو کچھ نہ کچھ اقدار کو ماننا ہوگا۔ کسی نہ کسی نظریہ کو قبول کرنا ہوگا، خیر و شر اور فلاح و خسران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہوگا۔ اور اس کی روشنی میں اپنی ضروری پالیسی کو ترتیب دینا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جا رہی ہے۔ اور وہ بنیادیں جن پر سیکولرزم کا نظام فکر قائم تھا۔ تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں۔ لیکن دنیائے حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ جن بنیادوں پر یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا۔ وہ گر چکی ہیں۔ اور محض تمناؤں کے ذریعہ اس خلا کو پر نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی دنیا میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجائش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے۔ جو سیکولرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے۔

(ج) اسلامی ریاست ایک خالص قومی ریاست سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ

اس کی بنیاد محض قوم پر نہیں نظریہ اور اصول پر ہے اور پھر خود اسکا تصور قومیت بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ اسلام ایک بالکل نئی طرز کی قومیت نظریاتی قومیت کا تصور پیش کرتا ہے اور اسلامی ریاست اس نئے تصور کی علمبردار ہوتی ہے۔ اس ریاست کے لیے جغرافیائی حدود تو ناگزیر ہیں لیکن اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ انسانیت، رنگ، نسل، زبان، اور محدود وطنیت کی مصنوعی پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالمگیر ریاست قائم کرے۔ جب تک یہ نصب العین حاصل ہو جغرافیائی حد بندیوں کو گوارا کرتا ہوگا۔ لیکن پوری امت کی وحدت یا کم از کم اس کی ایک دولت مشترکہ کا قیام ایسی ریاست کے پیش نظر رہے گا۔ اس طرح یہ ان ریاستوں سے بھی مختلف ہو گی جو محض جغرافیائی قومیت پر مبنی ہیں اور جن کے پاس کوئی نظریہ اور دعوت نہیں۔

(۵) اسلامی ریاست بلاشبہ حکومت الٰہیہ کی داعی ہے لیکن یہ پاپائی ریاست اور تھیاکریسی سے بھی مختلف ہے۔

اسلام اور تھیاکریسی :-

تھیاکریسی وہ نظام ہے جس میں حکمرانی کے اختیارات خدا کو ہوں اور مذہبی پروہتوں کا طبقہ اس کے نمائندہ کی حیثیت سے یہ کام انجام دے۔ روالینسٹوں پالک "مذہب اور مذاہب کی ناموس" میں اس کی یہ تعریف کرتا ہے۔

"حکومت کی ایک ایسی قسم جس میں اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے حقیقی حکمران پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور قوانین کو احکام خداوندی سمجھا جائے"

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں وغیرہ میں ملتی ہیں۔

اسلامی ریاست خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن یہ تھیاکریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور وجوہ اختلاف مختصراً یہ ہیں۔

(۱) تھیا کریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے جس کی رائے قانون ہوتی ہے جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا اسلام میں ایسے کسی مستقل طبقہ کا کوئی وجود نہیں۔ بندہ اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لیے یہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے واقفیت ہر مسلمان کا فرض بھی ہے۔ سیاست میں بھی نظام حکومت چلانے والے خدا اور امت دونوں کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے اصحاب امر کے لیے کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے حصول کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

(۲) اسلامی تاریخ میں ہمیں کبھی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آتی۔ جیسی یورپ یا ہندوستان، جاپان اور تبت میں ملتی ہے۔ ہمارے یہاں علماء حق کے علمبردار اور آزادی کے محافظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ خود ظلم و ستم اور استبداد کا نشانہ بنے ہیں ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے سرخیل علماء رہے ہیں اور عالم بننے کا راستہ ہر شخص کے لیے کھلا رہا ہے۔ نیز عام سیاسی تاریخ میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے "مذہبی دیوانوں" کی طرح عوام کو نشانہ ستم بناتی ہو۔ اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں کہ مذہبی حکومت کے سلسلہ میں یورپ کا تجربہ اور عالم اسلامی کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

"مشرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیا کریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ ہم یہاں ظلمت پسندی، خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے"۔

(۳) دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھا کریسی میں نام تو خدا کا تھا۔ لیکن چونکہ ان کے پاس زندگی کے ہمہ جہتی مسائل کے لیے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی۔ اس لیے پادریوں اور پروہتوں نے خدا کے نام پر اپنی رائے پیش کی۔ اور

خدا کے قانون کی بجائے اپنا قانون چلایا جو ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلودہ تھا جن سے انسانی قانون خصوصیت سے جب وہ ایک طبقہ کے مفاد کا محافظ بھی ہو، ہوا کرتا ہے، اسی لیے مذہبی طبقہ کو تنقید سے بالاتر قرار دیا گیا تاکہ اس کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لی جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے یہاں واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں ایک شوشے کا تغیر بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا۔ اولی الامر سے اختلاف کی پوری پوری گنجائش ہے بلکہ ان پر تنقید اور محاسبہ فرض کئے گئے ہیں۔ تاکہ وہ راہ صواب سے نہ ہٹیں۔ ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے ضرورت صرف علم کی ہے۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیاکریسی سے بالکل مختلف کر دیتی ہے۔

تھیاکریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن بیحد اہم فرق پایا جاتا ہے تھیاکریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ یہ دنیا ایک بری چیز ہے اس کی زندگی ہمیں گناہ کی پاداش میں اختیار کرنی پڑی ہے اس کی حیثیت ایک "دار العذاب" کی سی ہے اور تمام انسانوں کو اس سزا کو برداشت کرنا چاہیئے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جد و جہد کرنا ایک غیر مطلوب شے بن جاتے ہیں اور انسان "تسلیم و رضا" کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے زندگی کی نعمتیں اس کیلئے فراہم کی گئی ہیں اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنا ہے ضرورت صرف علم کی۔ اس طرح جو نفسیاتی رویہ یہاں پیدا ہوتا ہے وہ تھیاکریسی کی بالکل ضد ہے۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظام تھیاکریسی سے بالکل مختلف ہے۔

ہماری یہ بحث ہمیں اس نتیجہ پر لاتی ہے کہ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی، مقصدی اور نظریاتی ریاست ہے۔

۲۔ شورائی اور جمہوری ریاست :-

اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست ہے اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ، نسل، نسب کسی کی بنیاد پر

کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں، وحدت آدم اور انسانی مساوات اس کے بنیادی اصول ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو پوری ملت کے معتمد علیہ ہوں ارباب امر تمام امور سلطنت میں بنیادی پالیسی باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کیمطابق چلاتے ہیں نیز تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں متعین ہیں حکومت خدا اور اس کے رسول کیطرف سے ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اور ان میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی مزاج ہے:۔

اسلامی جمہوریت کی پہلی بنیاد انسانی مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً و نساءً۔ (النساء - ۱)	خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اس سے اسکا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔
یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (الحجرات - ۱۳)	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ و قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہے۔
ولقد کرمنا بنی آدم ... (بنی اسرائیل - ۷۰)	اور ہم نے اولاد آدم کو صاحب عزت بنایا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللھم ربنا ورب کل شیءٍ انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ (احمد ادس ابوداؤد)	اے ہمارے اور ہر چیز کے رب! میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی ہیں۔

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ رسول اللہ (صلعم) نے دیا، وہ یہ تھا:

"خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت و نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ اے لوگو! تم سب آدم (علیہ السلام) سے ہو اور آدم مٹی سے بنے نسب کے

لیے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور حاکم اور محکوم، صاحب امر اور مامور میں اسلام کوئی تمیز نہیں کرتا۔ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے ایک بار ایک معزز خاتون کو چوری کی سزا میں قطع ید کی سزا دی جانے والی تھی کچھ صحابہ نے حضور صلعم سے سفارش کی آپ نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا اور فرمایا۔

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا (مسلم)

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشرتی مساوات جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد ارباب اختیار کا معتمد علیہ ہونا ہے یعنی یہ کہ ریاست کی ذمہ داریاں ان کو سونپی جائیں جو اس کام کے اہل ہوں اور جن پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

رسول اللہ (صلعم) کا ارشاد ہے!

"تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جنکو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں اور تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جنکو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں۔ اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔" (مسلم)

ارباب امر کے معتمد علیہ ہونے پر مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر متفق ہیں البتہ ان کا انتخاب کیونکر ہو، خصوصیت سے امیر یا خلیفہ کا۔ اس پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے شیعی نظریہ خلافت یہ ہے کہ خاندان نبوت کے سوا کوئی شخص خلافت کا اہل نہیں اور امامت د خلافت اللہ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہیں اس لیے انتخاب کا سوال نہیں۔ فرقہ زیدیہ انتخاب کے اصول کو مانتا ہے لیکن دائرۂ استحقاق کو محدود رکھتا ہے خوارج کا خیال تھا کہ ہر پاک سیرت خلافت کا اہل ہے البتہ عام حالات میں خلیفہ کو معزول کرنا جائز نہیں۔ معتزلہ ہر فرد کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ اہل سنت عمومی خلافت کے قائل ہیں البتہ خلیفہ کے لیے علم و اجتہاد، اخلاق فاضلہ

سیاسی تدبیر، فنون حرب میں مہارت وغیرہ کی شرائط مقرر کرتے ہیں * طریق انتخاب پر اختلاف کے باوجود تمام مکاتیب فکر کے سیاسی نظریات میں ارباب امر کا معتمد علیہ ہونا مشترک نظر آتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوری ہے یعنی مسلمانوں کے یہ معتمد علیہ افراد تمام امور سلطنت کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورہ کی روشنی میں طے کریں، اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی سے فرماتا ہے:

وشاورھم فی الامر (آل عمران - ۱۵۹)	اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ شہادت دیتے ہیں کہ:۔

ما رأیت احدًا اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری و ترمذی)	میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنیوالا نہیں پایا

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ - ۳۸)	اور ان کے امور آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔

خطیب بغدادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا: میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورہ کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔" (روح المعانی)

آپ (صلعم) کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرہ کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

"جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے ہوں"

(صحاح)

اس لیے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اسکا ایک لازمی جزو ہے: چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں:

ان الشوریٰ ھی من قواعد الشریعۃ وعزائم الاحکام۔(البستانی۔جلداول) شوریٰ شریعت کے قوانین اور محکم احکام میں سے ہے۔

مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملہ اور اس کی ہر منزل کے لیے ہے۔ اس کی شکل کیا ہو؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل حل وعقد ہوں، فہم و بصیرت رکھتے ہوں اور لوگوں کے معتمد علیہ ہوں۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کرے، کوئی اجتماعی کام جتنے لوگوں سے متعلق ہو مشورہ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو شریک کیا جائے اور مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو شوریٰ کا حق ادا ہو جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی تجویز کی جائے۔

اسلامی جمہوریت کی آخری بنیاد شہریوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہے۔ اور ان حقوق میں دراندازی کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ تمام حقوق خدا اور اس کے رسول کے عطا کردہ ہیں اور کسی شرعی دلیل یا حق کے بغیر ان میں سے کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی یا ان میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی دو قسمیں کرتی ہے۔ مسلمان شہری اور غیر مسلم شہری۔ غیر مسلم شہریوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں، انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے، البتہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ نظریاتی مملکت کے کلیدی مناصب پر فائز ہو سکیں۔ اور اسی کی مناسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں:-

(۱) **جان ومال اور ناموس کی حفاظت**: یعنی ریاست ضمانت دیتی ہے کہ اپنے شہریوں کے جان ومال اور ناموس پر نہ خود ہاتھ ڈالے گی اور نہ کسی اور کو ڈالنے دے گی۔ حضور(صلعم) کا ارشاد ہے:

فذلک المسلم الذی له ذمة الله ورسوله فلا تخفروا الله فی ذمته۔ (بخاری)

پس یہ وہ مسلم ہے جس کی جان ومال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ تو خبردار، اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه۔ (مسلم)

مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے اس کا خون بھی اس کا مال بھی اور اسکی آبرو بھی

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کے باب میں بھی اصول یہ ہے "جو کوئی ہمارا ذمی ہو۔ اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہو جائیں"*

اسی طرح تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کی ضمانت دی گئی ہے اور بقول قاضی ابو یوسف ؒ اصول یہ ہے کہ:

ولیس للامام ان یخرج شیئاً من احد الا بحق ثابت معروف (کتاب الخراج صفحہ ۳۷)

امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے اس کی کوئی شئے نکالے۔

(۲) **شخصی آزادی**:- ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہو گی - اور اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی کے سلب کرنے یا جماعت کے کسی حقیقی مفاد کو نقصان پہنچانے یا خطرہ میں ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضور (صلعم) کے خطبہ کے دوران ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شبہہ کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ آپ نے دو مرتبہ سوال سن کر

---

* حضرت علیؓ

سکوت فرمایا تاکہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے اور جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو آپ نے فرمایا!

خلوا له جیرانه - (ابوداؤد) اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔

اسلام کا یہ اصول ہے کہ:

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل - (موطا) اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) رائے اور مسلک کی آزادی:- اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اختلاف رائے کو خونریزی اور فتنہ وفساد کا ذریعہ نہ بنالے۔ اس کی بہترین مثال وہ رویہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے مقابلہ میں اختیار فرمایا اور جو ریاست کے وجود ہی کی نفی کرتے تھے۔ آپ نے ان کو پیغام بھیجا کہ:

"تم جہاں چاہو رہو، اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے۔ کہ تم خونریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو۔ اور ظلم سے باز رہو" (نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۹)

اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے۔

لا اکراه فی الدین (البقرة - ۲۵۶) دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔

(۴) قانونی مساوات:- یعنی تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب، سیاہ ہوں یا سفید، صاحب امر ہوں یا مامور، قانون کی نگاہ میں برابر ہونگے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہوگا۔

(۵) معاشرتی مساوات:- یعنی خون، رنگ، نسب، زبان، پیشہ، معاشی مقام وغیرہ کی بنا پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سب برابر ہیں عزت و شرف اگر ہے تو صرف علم و تقویٰ کی بنا پر۔

(۶) بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف:۔ یعنی اسلامی ریاست ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچائے گی اور حصول انصاف کا انتظام بلا کسی معاوضہ کے کرے گی۔

(۷) فریاد، اعتراض اور تنقید کا حق: تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہوگا۔ کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات ارباب اختیار تک پہنچائیں، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں ان کی پالیسیں پر اعتراض اور تنقید کریں۔ ان کی بات سنیں اور انہیں اپنی بات سنائیں۔

(۸) اجتماع، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی آزادی: انہیں یہ حق بھی حاصل ہوگا۔ کہ منظم و مجتمع ہو کر کام کریں اور بلا روک ٹوک ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں۔

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں۔ معروف میں عدم اطاعت کی روش اسلامی ریاست کے مزاج کے منافی ہے۔ اسی طرح ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی خیر خواہی کریں یعنی دیدہ و دانستہ ایسا کام نہ کریں جو ریاست کو نقصان پہنچانے والا ہو، تخریبی سرگرمیوں سے خود بھی کلی طور پر مختصر رہیں اور دوسروں کو بھی نہ کرنے دیں۔ نیز یہ بھی خیر خواہی ہی کا ایک پہلو ہے۔ کہ امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت یا اس کے کارکنان کو خدا کے راستہ سے ہٹنے نہ دیں۔ اور اگر کوئی انحراف واقع ہو رہا۔ تو اس کو روکیں، ہاتھ اور زبان دونوں سے۔ اسلامی ریاست کا شہریوں پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے تعاون کریں اور اس کی خاطر مالی اور اگر ضرورت ہو تو خود جان کی قربانی پیش کریں۔

مندرجہ بالا چار بنیادوں پر اسلام کا جمہوری نظام قائم ہے۔

اسلام، اشتراکیت اور جمہوریت:۔

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اشتراکی امریت اور مغربی طرز کی جمہوریت دونوں سے مختلف ہے۔

۱۔ اشتراکیت مذہب کی نفی پر مبنی ہے اور اسلامی ریاست خدا کے قانون کی تابع اور اسے قائم کرنے والی ہے۔

۲۔ اشتراکیت فرد کی مستقل اور جداگانہ شخصیت کو نہیں مانتی اور اسے طبقہ میں ضم کر دیتی ہے اور ریاست کو ایک طبقہ کا آلۂ کار بنا دیتی ہے اسلام ان میں سے کسی چیز کو بھی درست نہیں مانتا۔ وہ فرد کو بنیاد مانتا ہے اور اس کی شخصیت کو مستحکم کرنے اور نشوونما و ارتقاء دینے کے مواقع فراہم کرتا ہے وہ طبقات کی نفی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے۔

۳۔ اشتراکیت کا نظام آمرانہ ہے جبکہ اسلام کا نظام شورائی ہے۔ اس میں تمام امور لوگوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتے ہیں ان پر اوپر سے ٹھونپے نہیں جاتے۔

۴۔ اشتراکیت ریاست کے اختیارات کو غیر محدود کر دیتی ہے اور شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی حقیقی ضمانت نہیں دیتی۔ اسلام ریاست کے اختیارات کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر دیتا ہے اور معصیت میں اطاعت کو یا حقوق انسانی کے بلا حق شرعی ختم کئے جانے کے امکان کو ختم کر دیتا ہے وہ حکومت کو مسئول بناتا ہے اور اسے عوام کے مشورہ کا پابند کرتا ہے نیز شخصی اور سیاسی آزادی کی حقیقی ضمانت دیتا ہے اسلامی ریاست ہمہ گیر تو ضرور ہے لیکن اشتراکیت کی طرح کلیت پسند نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اسلامی ریاست اشتراکی آمریت سے بالکل مختلف ہے۔

پھر اسلامی ریاست خود مغربی جمہوریت سے بھی مختلف ہے۔ اسلام کو جمہوریت کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورہ سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلاء سے کچھ زیادہ ہی شدومد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہیئے اور قانون کی حکمرانی کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جانچنے اور اس کو موثر بنانے کے لیے جو نظام اور جو ڈھانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں اسلام جن چیزوں میں مغربی جمہوریت سے اختلاف رکھتا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت

کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے، بنیادی قانون قرآن و سنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر صد فی صد افراد خدا کے قانون کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اسکا اختیار نہیں، ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے اس میں عوام اور ان کے نمائندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی و عمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے ان میں تفصیلات طے کریں۔ اس طرح جمہور کے قانون سازی کے مطابق اختیار کے مقابلہ میں اسلام ان کے محدود اختیار کو تصور پیش کرتا ہے اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں۔ ہمارے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور ہمیں اپنے معاملات اس کے مطابق ہی طے کرنے ہیں۔

۲۔ جمہوریت میں ہر لحظہ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا رہتی ہے اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے:

وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (المائدۃ ۲)	نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرو اور برائی اور گناہ کے امور میں ہرگز تعاون نہ کرو

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

۳۔ اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیئے جائیں۔ جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ حضور صلعم کا ارشاد ہے۔

"بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدہ پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو"

(بخاری و مسلم)

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس حکومت کے کسی عہدہ منصب کا طالب ہو"

(ابوداؤد)

اس طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب امر کے لیے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جبکہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی۔

۴۔ جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے جبکہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے اور اسکا پیغام عالمگیر ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ہمارے سامنے اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یعنی اس کا شورائی اور جمہوری کردار آجاتا ہے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ریاست اشتراکی سیاست اور مغربی طرز کی جمہوری ریاست سے کن باتوں میں مختلف ہے۔

۳۔ فلاحی ریاست:۔

اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ امن و امان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے۔ بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں حقیقی اور فطری مساوات قائم کرے، ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو سعی و جہد کی مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے تمام شہریوں کی، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے۔ اگر اسلامی ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس ہے۔ ظلم و جور ہے، تو اس کا قلع قمع کرے اور اپنی تمام توجہ ان انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے وقف کر دے۔ اسلام ریاست کا محض ایک منفی تصور نہیں رکھتا۔ اس کی قائم کردہ ریاست ایک مثبت ریاست ہے جو قیام انصاف اور ادائگی حقوق کے ایجابی کام انجام دیتی ہے۔

معاشی زندگی کے بارے میں اسلام نے یہ اصولی ہدایت دی ہے۔ کہ اسلامی معاشرہ اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ افلاس اور غربت کو مٹانے میں اس طرح سرگرم رہیں۔ جس طرح کفر کی ظلمتوں کو دور کرنے میں ہوں۔ نبی صلی واللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ "فقر انسان کو کفر کی طرف لے جاسکتا ہے"، اور آپ صلعم نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ مجھے کفر اور فقر دونوں سے محفوظ رکھ۔"

اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور اسے دعوت دیتا ہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔ محنت کی روزی اور پاک اور طیب کمائی پر قرآن و حدیث میں غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔

اسلام نے انفرادی ملکیت کا حق دیا ہے اور انفرادی سعی وجہد کے دروازے سب کے لیے کھول دیئے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پیدا کیا ہے کہ یہ ملکیت ایک امانت کی طرح ہے جسے جائز اور صحیح راستوں ہی پر صرف کرنے کا اختیار ہے اگر انہیں غلط اور حرام طریقوں سے خرچ کیا جائے گا تو امانت میں خیانت ہوگی، فرد کا اختیار محدود ہے غیر محدود نہیں۔ نیز ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اسکے بندوں کا حق بھی ہے ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف کرے جو دولت کو جمع کرتے ہیں اور انسانی بہبود کے لیے اسے خرچ نہیں کرتے یا اس میں سے دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے، ان کے لیے سخت ترین وعید آئی ہے۔ تمام مسلمانوں پر زکوٰۃ کی فرض کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ:

توخذ من اغنیاءھم فترد علی فقراءھم۔ (بخاری و مسلم)	ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور انکے محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

پھر اسے محض ایک خیرات نہیں بلکہ "حق" قرار دیا گیا ہے۔

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ (الذاریات - ۱۹)	ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کے لیے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لیے۔

یہ حق حکومت کو وصول کرنا ہے اور حقداروں تک پہنچانا ہے۔

خذ من اموالھم صدقۃ (التوبہ ۱۰۳) (اے نبی) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام افراد کی کفالت کا بندوبست کرے جو مجبور ہوں۔ اپاہج ہوں۔ ناچار ہوں۔ یا رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

حضور صلعم کا ارشاد ہے:

من مات و علیہ دین و لم یترک وفاءً فعلیّ قضاءہ ومن ترک مالاً فلورثتہ۔ (ابوداؤد)

جو شخص مرجائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اسکے وارثوں کا حق ہے۔

من ترک دیناً او ضیاعاً فلیأتنی فانا مولاہ۔ (ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پس ماندگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئے میں اس کا سرپرست ہوں۔

من ترک مالاً فلورثتہ و من ترک کلاً فالینا۔ (بخاری و مسلم)

جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔

* امام ابو یوسف کتاب الخراج میں ایک جلیل القدر صحابی کی زبان سے یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ:

"خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا"

حضرت خالد نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس میں یہ صراحت یہ موجود تھا۔ کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا۔ یا جو کسی آفت کا شکار ہوگا یا جو مفلس ہو جائے گا۔ اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔ †

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم ان تمام آیات و احادیث و آثار کی روشنی میں علماء کا یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ:

"اور علمائے نے لکھا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے۔ جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے

کی بھی ذمہ دار ہے جبکہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی شے چھوڑے بغیر مرجائے نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لیے بھی ذمہ دار ہوگی جبکہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔ ٭٭

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ:

"اور ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فیئ (بیت المال کی آمدنی) سے ان غرباء کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجات کے مطابق روٹی مہیا ہو۔ پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے ٭"

اسلامی ریاست کی یہ حیثیت محض نظری دلائل ہی سے ثابت نہیں ہے بلکہ قرن اول میں مسلمانوں نے اس نظام کو من و عن قائم کیا تھا اور دنیا کی پہلی فلاحی اور خادم خلق ریاست بنائی تھی۔ مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی۔ ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کیلئے دو

٭٭ زاد المعاد۔ جلد اول۔ صفحہ ۷۵

٭ علامہ ابن حزم محلیٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریب بھائیوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے، ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے محض اس بنا پر کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا۔ اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔"

غریب آٹا کافی ہوتا تھا اس لیے ہر شخص کے لیے اسی قدر آٹا مقرر تھا غرباؤ مساکین کے لیے بلاتخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے انکے روزینے مقرر کردیئے جائیں۔

یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قائم کیا اور یہ چیز اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت کو متعین کرتی ہے۔

یہاں بھی اسلامی ریاست دنیا کی دوسری ریاستوں سے بڑی مختلف ہے سرمایہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ:

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اس کے لیے کوئی سہارا نہیں۔ کشمکش حیات میں اس کے لیے مٹ جانا ہی مقدر ہے۔ سعی و جہد اور مواقع کی مساوات بھی اس نظام میں محدوم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے امیر تر ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لیے غربت کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس نظام میں ظلم اور استحصال کے نت نئے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور غیر منصوبہ بند معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدم استحکام اور افراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اسلامی ریاست ایک منصفانہ معاشی اصول پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی مواقع دینے کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر پیمانہ پر گرتوں کو تھامنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

یہ فلاحی ریاست اشتراکیت سے بھی مختلف ہے۔ اس لیے کہ یہ کفالت کی ضمانت تو دیتی ہے لیکن آزادی اور انفرادیت کی قیمت وصول کر کے نہیں۔ کلی قومی ملکیت اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔ وہ مالکانہ حقوق اور آزادی جہد دینے کے بعد توازن اور انصاف قائم کرتی ہے۔

نیز جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلاحی ریاست سے بھی یہ مختلف ہے۔ کہ اس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے۔ محض سیاسی احتجاج کا منہ بند کرنے کے لیے نہیں۔ یہاں اس کا حصول مطالبات اور احتجاجات پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ جسے ہر قیمت پر اور ہر حال

ہیں پورا کرتا ہے یہ سارا کام جبر اور رسہ کشی کے ساتھ نہیں بلکہ دلی تعاون اور جذبہ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے یہاں صرف معیار زندگی ہی کو بلند نہیں کیا جاتا بلکہ معیار اخلاق کو بھی بلند کیا جاتا ہے یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے اور اخلاقی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے بہت اونچا ہے۔

معلم اور داعی ریاست

اسلامی ریاست کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سپرد محض معاشی کفالت کی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی ترویج بھی اس کے ذمہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" وہ ریاست جو آپ کی نیابت کرتی ہے اپنے شہریوں کی بالخصوص اور تمام انسانوں کی بالعموم تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرتی ہے اور پوری دنیا کے لیے حق کی شاہد اور اسلام کی علمبردار کی حیثیت رکھتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ۔ علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے

آپ (صلعم) نے اس فریضہ کی بجا آوری کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ غزوہ بدر میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ (صلعم) نے یہی قرار دیا کہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں بعض لوگوں کیلئے آپ نے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلہ میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔بالغ عوام میں تعلیم کو پھیلانے کے لیے آپ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجتے رہتے تھے۔مسجد نبوی کے باہر ایک چبوترہ تھا جسے "صفہ" کہتے ہیں اور جو اسلام کا پہلا مدرسہ بنا۔یہاں سے تربیت دے کر لوگوں کو پورے عرب میں تعلیم کے لیے بھیجا جاتا تھا۔مدینہ سے باہر کے مسلمانوں کے لیے یہ قاعدہ تھا۔کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے باصلاحیت افراد کو مدینہ بھیجتے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے اپنے علاقہ میں تعلیم پھیلاتے۔باہر سے جو وفود آپ صلعم کے پاس آتے آپ صلعم ان میں کے ذہین اور ذی صلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر کرتے۔ جن

لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر فرماتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ مثلاً جب آپ صلعم نے عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنایا تو سب سے پہلے ہدایت یہ دی کہ:

"وہ حق پر قائم رہیں جیساکہ اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور بھلائی کا حکم دیں۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کر دیں۔ اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکیں۔ اور لوگوں کی دلداری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کیطرف مائل ہو جائیں"

تعلیم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے لیے سوسائٹی کے ہر شعبہ میں شرف و اعزاز کا معیار علم کو قرار دیا۔ اور مسجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدیداروں تک کے تقرر میں جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا۔ وہ قرآن و حدیث کا علم ہے۔ پوری اسلامی قلمرو میں بے شمار افراد کو اس کام پر مقرر کر دیا گیا تھا کہ لوگوں میں پھیل جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں۔ اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر، قریہ قریہ، محلہ محلہ اور گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا۔ اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے باصلاحیت اور سمجھدار کارکن میسر آتے گئے جو زندگی کے ہر شعبہ کی قیادت کر سکیں۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ تعلیم کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی اور حکومت اور اہل ثروت نے اس کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ یہ ریاست کی ذمہ داری تھی۔ کہ تمام شہریوں کے لیے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے۔

۲۔ تعلیم کے نظام میں اولین اہمیت علوم دین کو دی گئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کی ترویج کی گئی۔ جو دفاع دین اور قیام حیات کے لیے ضروری ہیں۔ نیز فضول اور لغو مضامین سے اجتناب کی کوشش کی گئی۔

۳- تعلیم ہر دور میں مفت رہی مسلمانوں نے ایک دن کے لیے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو بھی فیس کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ علم اور ساونچے سے اونچے درجہ کے علم کے دروازے ہر شخص کے لیے بلا فیس کھلے رہے۔

۴- تعلیم کے ساتھ کردار سازی اور اخلاقی تربیت ایک جزء لاینفک کی طرح موجود رہے۔

پھر یہ ریاست صرف اپنے شہریوں ہی کی تعلیم کا بندوبست کر کے مطمئن نہیں ہوجاتی بلکہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو اپنے قول و عمل اور مثال سے پیش کرتی ہے قرآن کا ارشاد ہے

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللہ۔ (آل عمران - ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور امت کا یہ فرض مقرر کیا گیا کہ :-

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (آل عمران - ۱۰۴)	تم کو ایسی امت بننی چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دے نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔

اور اس امت کے ذمہ شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا۔

لیکون الرسول شھیداً علیکم وتکونوا شھداء علی الناس (الحج ۷۸)	تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کے گواہ ہو

یہ بحث اسلامی ریاست کی ایک اور بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ ریاست ایک معلم کی طرح ہے اسے اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش بھی کرنا ہے۔ اس طرح یہ ریاست ایک طرف لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو بلند کرتی ہے اور دوسری طرف ایک عالمگیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ قومیت کے کسی تنگ نقطۂ نظر سے وابستہ نہیں اس کی دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے اس پہلو سے یہ ریاست بالکل منفرد ہے۔

اسلامی تصور قومیت

اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیت کے اس مطالعہ کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مختصراً اسلام کے تصور قومیت پر بھی گفتگو کر لی جائے۔

مذہبی اور اجتماعی زندگی کا ایک بنیادی تقاضا ہے کہ انسانوں کے درمیان اشتراکیت اور تعاون ہو۔ قوم سے مراد انسانوں کا وہ گروہ ہے جس میں اجتماعی وحدت پائی جاتی ہو اور جو ساتھ رہنے کا جذبہ رکھتا ہو اشتراک اور اتحاد کے اس احساس کا نام قومیت ہے۔ یہ احساس ایک عصبیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اپنی قوم کے افراد سے محبت اور ان افراد سے غیریت پیدا ہوتی ہے جو اس دائرہ سے باہر ہوں۔ اسطرح قومی مفاد کا جذبہ رونما ہوتا ہے جو اگر تیز تر ہو جائے تو انسان سے کہلوا دیتا ہے کہ "میری قوم۔ خواہ حق پر ہو یا ناحق پر"

اس وحدت و اشتراک کو پیدا کرنے والے عوامل بہت سے رہے ہیں ان میں سے اہم یہ ہیں۔

نسل۔ یعنی ایک خاص نسل سے وابستہ ہونا جو "نسلیت" کو پیدا کرتا ہے دور جدید میں صیہونیت اور نازی ازم اس کی مثالیں ہیں۔

رنگ۔ یعنی ایک خاص رنگ کے لوگ اپنے کو ایک قوم سمجھیں اور دوسری رنگ کے لوگوں کو اپنی قوم میں شامل نہ ہونے دیں۔ افریقہ کا نسلی امتیاز اس تصور پر مبنی ہے یہی صورت امریکہ میں بھی ہے خصوصیت سے جنوبی ریاستوں میں۔

زبان۔ زبان فکری وحدت پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور قومیت کی تشکیل میں ایک اہم قوت بن جاتی ہے۔ عرب قومیت کی بنیاد زبان ہی پر ہے۔

معاشی اغراض اور نظام حکومت۔ ایک ہی معاشی نظام یا ایک ہی سلطنت سے وابستگی بھی قومیت کا جذبہ پیدا کرنے والے عوامل رہے ہیں۔

وطن۔ یعنی ایک خاص خطہ زمین پر آباد ہونا۔ یہ وطنیت ہے اور اس وقت سب سے زیادہ چلن اسی کا ہے۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جو انسانی تاریخ میں آج تک قومیت کی تشکیل کرتے رہے ہیں اسلام کا نقطہ نظر اس باب میں یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کلی طور پر قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ سب مل کر بھی انسان کی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔

نسل، رنگ، زبان یا وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر عقلی اور غیر فطری ہے محض کسی نسل سے وابستہ ہونا انسانی اتحاد کے لئے کافی نہیں۔ خون کے رشتہ کی ایک اہمیت ہے لیکن چند نسلوں کے بعد یہ رشتہ کمزور اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے پھر کون اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ کسی خاص گروہ کی رگوں میں خاص اس نسل کا خون گردش کر رہا ہے اور کوئی دوسرا میل اس میں نہیں ہوا پھر اگر نسل ہی کو لینا ہے تو اس حقیقت کو کیوں نہ ملحوظ رکھا جائے کہ تمام نسل انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے۔ اسلام رشتہ رحم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا قطع رحم کو منع کرتا ہے اور خاندان اور کنبہ کے حقوق متعین کرتا ہے لیکن قومیت اور سیاسی فکر کے لئے اسے ایک بنیادی عامل تسلیم نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اور حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا دین و عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے اس قومیت کا جزو نہ بن سکے جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔

رنگ کی بنیاد پر تفریق ایک سراسر غیر عقلی، غیر فطری اور غیر منصفانہ فعل ہے اسی لیے حضور (صلعم) نے ارشاد فرمایا کہ "گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں" اور فرمایا کہ "اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔"

زبان و ادب قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے میں بڑا حصہ ادا کرتے ہیں لیکن یہ بھی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ زبان کے اشتراک سے زیادہ ضروری چیز افکار، نظریات، عقائد اور جذبات کا اشتراک ہے جبکہ اظہار کا ایک ذریعہ زبان ہے امرؤ القیس عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا لیکن جن نظریات کی اس نے تبلیغ کی وہ غلط اور باطل تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں فرماتے ہیں "اشعر الشعراء قائدہم الی النار"۔ (یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے) معلوم ہوا کہ اسلام کی نگاہ میں اصل چیز صحت فکر اور پاکیزگی بیان ہے۔ محض ایک خاص زبان و ادب کی پوجا نہیں۔ یہی حال معاشی اغراض اور سیاسی قسمت کے اشتراک کا ہے۔ یہ اپنا کوئی مستقل اور پائدار وجود نہیں رکھتیں اور ایک پائدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

آخری چیز وطن کا اشتراک ہے اور بلاشبہ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے لیکن سوچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا محض وطن انسانی معاشرہ میں قومیت کی

بنیاد بن سکتا ہے؟ وطن کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص ایک خاص علاقہ میں پیدا ہوا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو جس زمین پر ایک شخص پیدا ہوتا ہے وہ ایک یا دو مربع گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر اس ایک یا دو مربع گز کو وسیع کر کے ایک خاص ملک کی حدود تک لایا جا سکتا ہے تو آخر پوری دنیا تک اس کو وسیع کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

وطن سے ایک حد تک لگاؤ فطری ہے اور اسلام اس کو نہیں مٹاتا لیکن زندگی کی بنیادی وفاداری اور اتحاد کی اصل بنیاد وطن کی بجائے اصول اور نظریہ، مسلک اور دین کو قرار دیتا ہے جس کی خاطر اگر ضرورت پیش آجائے تو وطن سے ہجرت کو بھی ضروری سمجھتا ہے اقبال نے بہت صحیح کہا کہ ہجرت نبوی کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کا قیام وطنی قومیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

یہ تمام عوامل قومیت کے لیے کوئی عقلی اور اصولی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جس قسم کی قومیت کی تشکیل کرتے ہیں وہ غیر فطری ہے اس میں تنگ نظری اور تعصب پایا جاتا ہے اور انسانوں کے معاملات پر خاص انسانی اور اصولی نقطہ نظر سے حق و باطل کے اصولوں کی روشنی میں غور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ دراصل انسانوں کو جوڑنے کی بجائے بانٹتی اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، غلط عصبیتوں کو جنم دیتی ہیں اور انسانیت کو تباہیوں کی طرف دھکیلتی ہیں:

اسلام ان کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالمگیر نظریہ ہے۔ ہر وہ شخص جو اس دین کو قبول کرے ملت اسلامیہ کا جزو بن جاتا ہے اور جو اس کا باغی ہو وہ ملت کفر میں چلا جاتا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے :-

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

* اسلام نے رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت و سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو اٹھا دیا اور خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی مگر مادی اور ارضی امتیاز پر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی و طہارت عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوع انسانی کو دعوت دی۔ پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کردے وہ دوسری قوم سے ہے ان دونوں قوموں کے درمیان بنائے امتیاز نسل اور نسب نہیں اعتقاد اور عمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور کفر کی تفریق میں جدا جدا ہو جائیں اور دو بالکل اجنبی آدمی اسلام میں متحد ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہو جائیں۔ وطن کا اختلاف بھی ان دونوں قوموں کے درمیان وجہ امتیاز نہیں ہے یہاں امتیاز حق اور باطل کی بنیاد پر ہے جس کا کوئی وطن نہیں ممکن ہے کہ ایک شہر، ایک محلہ، ایک گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک حبشی رشتہ اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک مراکشی کا قومی بھائی بن جائے۔

رنگ کا اختلاف بھی یہاں قومی تفریق کا سبب نہیں۔ یہاں اعتبار چہرے کے رنگ کا نہیں، اللہ کے رنگ کا ہے اور وہی بہترین رنگ ہے۔

صبغة الله ومن احسن من الله صبغة۔	اللہ کا رنگ اختیار کرو) اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔

(البقرة - ۱۳۸)

ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اعتبار سے ایک گورے اور ایک کالے کی ایک قوم ہو اور کفر کے اعتبار سے دو گوروں کی دو الگ قومیتیں ہوں۔

زبان کا امتیاز بھی اسلام اور کفر میں وجہ اختلاف نہیں ہے، یہاں منہ کی زبان نہیں محض دل کی زبان کا اعتبار ہے جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے اعتبار سے عربی اور افریقی کی ایک زبان ہو سکتی ہے اور دو عربوں کی زبانیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

معاشی اور سیاسی نظاموں کا اختلاف بھی اسلام اور کفر کے اختلاف میں سے نہیں ہے یہاں جھگڑا دولت زر کا نہیں دولت ایمان کا ہے، انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے جو لوگ الٰہی کے وفادار ہیں اور جو خدا کے ہاتھ پر اپنی جانیں فروخت کر چکے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ کہیں رہتے ہوں اور جو خدا کی حکومت کے باغی ہیں وہ ایک دوسری قوم ہیں خواہ کسی سلطنت کی رعایا ہوں۔

اس طرح اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے اس دائرہ کا محیط ایک کلمہ ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ!

اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی، اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کرتا ہے۔

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں ملت اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول ہے اور اگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے ملت بہت سے ممالک میں بٹی ہوئی ہو ہر ملک کو خالص وطنی قومیت کے مقابلہ میں اسلام کی نظریاتی قومیت کو بنیاد بنانا چاہئے اور آہستہ آہستہ اتحاد اسلامی یا مسلمانوں کی دولت مشترکہ کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس طرح یہ ممکن ہے کہ بہت سی ریاستیں اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں، اور اپنے اپنے دائرہ میں اس انقلابی دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔

دور حاضر میں پاکستان کا وجود اسلامی قومیت کا مظہر ہے۔ یہ ملک خاص نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا اور پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے قیام کے لیے جدوجہد کی۔ یہ نہ ایک جغرافیائی وحدت ہے، نہ اس میں ایک زبان ہے، نہ اس کے رہنے والوں کی نسل ایک ہے اور نہ ان کا رنگ ایک سا ہے۔ جس چیز نے ان کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیا ہے وہ ان کا دین و ایمان اور ان کا نظریہ حیات ہے جسے غالب کرنے کے لیے انہوں نے یہ ملک قائم کیا ہے اور یہ ملک ہمارے لیے مقدس اسی لیے ہے کہ یہ اسلامی نظریہ کا علمبردار ہے۔

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول!

ایک اہم سوال پر بحث کی مزید ضرورت ہے۔ یعنی وہ ملک جو اسلامی نظریہ کو لے کر اٹھے اس کی خارجہ پالیسی کے اصول کیا ہوں؟ ملت اور ریاست کے تعلقات

دوسرے ممالک اور اقوام سے کن بنیادوں پر استوار ہوں؟ ذیل میں ہم ان اصولوں کی مختصر تشریح کرتے ہیں۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اور اسلامی ریاست کی حیثیت پوری دنیا کے سامنے خدا کی شریعت کے علمبردار اور اس کے پیغام کے داعی کی ہے قرآن اس کو "امت وسط" کہتا ہے اور اس کے منصب کو "شہادت حق" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ وہ امت ہے جو خدا کی طرف سے پوری انسانیت پر گواہ بنائی گئی ہے، جو اپنے قول و عمل اور پالیسی اور پروگرام کے ذریعے خدا کے دین کی شہادت دیتی ہے۔

اس لیے "اسلام میں "سیاست خارجہ" کا پہلا اصول یہ قرار پاتا ہے کہ یہ اسلام کی مبلغ اور حق کی شہادت دینے والی ہے اور یہ کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتی جو کسی طرح اس کی اس حیثیت کو مجروح کرنے والا ہو۔

(۲) وطن کی محبت اور اس کے مفاد کا تحفظ اس کی دوسری بنیاد ہے۔ وطن کی محبت سے مراد یہ ہے کہ ملک اور اس کے بسنے والوں کی حقیقی خیر خواہی، ان کے مفاد کا تحفظ، ان کے حقوق کے لیے جدوجہد اس کے اولین فرائض میں سے ہوں گے۔ اسلام وطن سے سچی محبت کو ایمان کے ثمرات میں سے سمجھتا ہے۔ لیکن یہاں اسلام کے نقطہ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام "میرا ملک! حق یا ناحق!" کے اصول کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ حق کی صورت میں ہر ممکن تعاون اور جدوجہد، اور ناحق کی صورت میں مخالفت اور درست کرنے کی کوشش فرض کرتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" صحابہ نے پوچھا "یا رسول اللہ! جب وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد سمجھ میں آتی ہے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے"؟ حضور صلعم نے جواب دیا "اس کی مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو"۔ پس یہی اصول اسلام خود قومی پالیسی کے لیے بھی تجویز کرتا ہے۔

(۳) اسلام کی سیاست خارجہ کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ وہ پوری امت مسلمہ کی وحدت کا داعی ہے اور ریاست کو ایسی تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیتا

ہے جو تمام مسلمانوں کو جوڑنے والی اور ان میں تعاون اور بھائی چارہ قائم کرنے والی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں ہوں لیکن ان کو اپنی پالیسی "دولت مشترکہ" بنانی چاہئے جو ہر حیثیت سے ان کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنا دے۔ قرآن میں ہے:

وان هذه امتكم امة واحدة و انا ربكم فاتقون۔ (المؤمنون - ۵۲)

اور دیکھو! یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں! پس تقویٰ اختیار کرو۔

واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا۔ (آل عمران - ۱۰۳)

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔

پھر اس کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں عام تعاون ہو بلکہ سیاست خارجہ کا ایک خاص مقصد پورے عالم اسلام کی سیاسی آزادی ہے۔ مسلمان آزاد رہنے اور صرف خدا کی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اور اگر دنیا کے سینہ پر ایک مسلمان بھی غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار رہے تو سارے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کو طاغوتی نظام سے آزاد کرائیں۔ اسلامی فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ "اگر ایک مسلمان عورت مشرق میں قید ہو تو اہل مغرب پر فرض ہے کہ اس کو فدیہ دے کر چھڑائیں۔ خواہ اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کا مال ہی کیوں نہ دینا پڑے"* ظاہر ہے اگر ایک عورت کو غلامی اور قید سے چھڑانے کے لیے یہ مسئلہ ہے تو پورے اسلامی ممالک کو اغیار کی غلامی اور مشرق و مغرب کے استعماروں سے آزاد کرانے کے لیے ہمارا مسلک کیا ہو سکتا ہے؟

(۴) اسلام فتنہ اور فساد کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کی خارجہ پالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہوگا۔ قرآن انسانی خون کے بہانے کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے الا یہ کہ حق کے ساتھ ہو۔

من قتل نفساً بغير نفس او فساد في الارض فكانما قتل الناس جميعاً و من احياها فكانما احيا الناس جميعا (المائدة ۳۲)

جس نے سوائے اس کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں فساد پھیلانے والوں کو سزا دینی ہو کسی انسان کو قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کا خون کیا اور جس کسی نے کسی کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔

* الشرح الصغیر بحوالہ حسن البنا "الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت"،

پھر قرآن ہر قسم کی زیادتی کی مخالفت کرتا ہے:

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا (المائدۃ - ۸)	اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ راہ انصاف سے ہٹ جاؤ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد امن قائم کرنا اور انسانی زندگی کو سکون کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ لیکن اسلام نے صرف اتنی بات کہہ کر معاملہ کو ختم نہیں کر دیا ہے ورنہ اس میں اور اہنسا میں کوئی فرق نہ رہتا۔ اسلام نے ان اسباب کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اس لیے کہا گیا ہے کہ طاغوت کی قوت کو ختم کرو اور زمین سے فتنے کو بالکل مٹا دو۔ تب ہی حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے:

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین (البقرۃ - ۱۹۳)	"اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے۔ اور دین اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔ اگر وہ فساد سے باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔

اس طرح اسلام ان اسباب کو بھی دور کرتا ہے جو امن کو تہ و بالا کرنے والے ہیں۔

(۵) اسلام جغرافیائی حدود کو انسانیت کو مستقل طور پر بانٹنے والی حدود نہیں مانتا۔ وہ ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنا چاہتا ہے جو ایک قانون کے تابع اور ایک مرکز سے وابستہ ہو۔ اور جس میں انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے والی چیز نسل، رنگ، زبان اور وطنی حدود نہ ہوں۔ بلکہ پوری انسانیت ایک خاندان بن جائے۔ اور اگر کسی بنیاد پر ان میں فرق ہو تو وہ ایمان اور تقویٰ ہیں۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں۔ جو کسی قوم، رنگ یا نسل سے وابستہ نہیں بلکہ پوری انسانیت ان کے سلسلہ میں برابر ہے ہر شخص انہیں حاصل کر سکتا ہے۔

حدیث میں پوری انسانیت کو "عیال اللہ"* کہا گیا ہے۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیاله - (بیھقی)

"ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو عیال اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے"

اس طرح اسلام پوری عالمی انسانی برادری کی تنظیم کا مدعی ہے۔

(۶) عہد و پیمان کی پابندی بھی اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا ایک اصول ہے اور اسلام اس پر سختی سے عمل کا حکم دیتا ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود - (المائدۃ - ۱)

"اے ایمان والو! اپنے معاہدے پورے کرو"

صرف اس صورت میں معاہدہ توڑا جا سکتا ہے جب دوسرا فریق اس کی خلاف ورزی کرے، اس موقع پر معاہدہ اس کے منہ پر دے مارنے سے ظاہر ہے علانیہ بے تعلقی کا اعلان ہو جائے گا۔

فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم - (التوبۃ - ۴)

پس ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ تک پورا کر دو۔

(۷) بین الاقوامی تعلقات میں اسلام بدلہ لینے کو جائز قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ لازم کر دیتا ہے کہ بدلہ اتنا ہی لیا جائے جتنا حق ہے۔ اور ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے نیز اگر درگزر اور حسن سلوک کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ قوی تر ہے۔

وجزاؤ سیئة سیئة مثلھا - (الشوریٰ - ۴۰)

ہر برائی کا بدلہ تو بس اس کے برابر برائی ہی ہو سکتا ہے۔

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم - (البقرۃ - ۱۹۴)

پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے برابر کی زیادتی کر کے اپنا بدلہ لے سکتے ہو (اس سے زیادہ نہیں)

* اللہ کا گھرانہ۔ خاندان۔ برادری

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین (النحل - ۱۲۶)	اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اور اگر تم نے صبر کیا تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لیے صبر ہی بہتر ہے۔

ان آیات کی روشنی میں سیاست خارجیہ کا ایک اصول یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کو دوسرے ممالک سے بدلہ لینے کی اجازت ہے لیکن حسن سلوک، کسی کی پالیسی بہر حال قابل ترجیح ہے باقی کس موقع پر کونسا رویہ اختیار کیا جائے اس کا فیصلہ لا محالہ واقعات وحقائق کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا مباحث اسلام کے سیاسی نظام کو واضح کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک سیاسی نظریہ ہے اور وہ ایک مخصوص مزاج کی ریاست قائم کرتا ہے جو دور حاضر کی اور سب ریاستوں سے مختلف اور ان سے بہت اعلیٰ اور بہتر ہے۔

اِسلام کے تقاضے

اسلام کا تصورِ دین

۱: دنیا میں اس وقت مذہب کے تین مختلف تصور پائے جاتے ہیں:

(الف) ایک تو یہ کہ دنیا انسان کے لیے حقیقتًا ایک قید خانہ ہے۔ اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے۔ جب وہ اس قید خانے کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے۔ یعنی وہ دنیا کو چھوڑ کر بستیوں سے دور ایک گوشہ میں بیٹھ کر خدا سے لو لگائے۔ اور دنیا جہان کے سارے بکھیڑوں سے آزاد ہو کر خدا کی جناب تک رسائی حاصل کرلے۔ دین اور خدا پرستی کے اس نظریئے کا نام "رہبانیت" یا "یوگ" ہے۔

(ب) دوسرے تصور کی رو سے انسان کو دنیا سے منہ موڑنے اور نفس کشی کی حاجت نہیں۔ بلکہ اسے دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنا چاہیئے۔ جہاں تک دینوی معاملات کا تعلق ہے انسان صرف انفرادی زندگی میں دین کا پابند ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں وہ آزاد و خود

مختار ہے کیونکہ "عبادت" فرد کا کام ہے۔ جماعت کا نہیں۔ نیز دین انسان اور خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔ چنانچہ عام دنیاوی اور اجتماعی مسائل میں انسان آزاد ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور ہے اور اسے "ادھوری دینداری" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(ج) تیسرا تصور یہ ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی اور نفس کشی دونوں غلط ہیں اور دین و بندگی کو صرف نجی اور انفرادی معاملہ تصور کرنا بھی بالکل غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں دین کا پابند اور بندگی کا محتاج ہے۔ اسے جتنی قوتیں دی گئی ہیں وہ صرف بندگی کے لیے ہی عطیہ ہیں۔ یعنی نہ انہیں بالکل آزاد چھوڑا جائے۔ نہ ان کو کچلا جائے۔ صحیح دین داری اور خدا پرستی یہ ہے کہ انسان زندگی کا ہر لمحہ احکام الٰہی کے تحت گزارے اور دنیوی زندگی کا پورا نظام مالک حقیقی کا پسندیدہ ہو یہ اسلام کا تصور دین ہے۔

اسلام کا یہ تصور دین رہبانیت سے کسی قسم کا لگا نہیں کھاتا۔ انسان کے رب نے جو حقیقی فرمانروا اور قانون ساز بھی ہے پوری زندگی کے لیے احکام و قوانین مقرر کئے ہیں اسکے بنیادی عقائد و اعمال مثلاً نماز، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی ٹھیک ٹھیک ادائگی کے لیے اجتماعیت کو ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اجتماعی فضا سے ہٹ کر بطور خود نماز روزے کی ادائگی سے وہ تمام فوائد و مصالح ہرگز نہ حاصل ہو سکیں گے جو شریعت میں مقصود ہیں اور اسلام کے پورے احکام کی بجا آوری اجتماعیت کے بغیر ممکن نہ ہوگی۔ نیز قرآن و حدیث میں اس سے صاف برائت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:

لا رھبانیۃ فی الاسلام (حدیث) "اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے"

ایک دوسری حدیث میں ہے "ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کی بجائے آسان اور خالص دین ابراہیمی عطا فرمایا ہے"۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنا ھا علیھم - الحدید - ۲۷) "اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کرلی ہے ہم نے تو انہیں اسکا حکم نہ دیا تھا"

گویا نہ صرف اسلام میں بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی شریعت میں بھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح دین کا مزاج رہبانیت کو برداشت نہیں کرتا اور اسکے بنیادی عقائد و اعمال اسکے مخالف ہیں، ٹھیک یہی حال اس کی تفصیلی تعلیمات کا بھی ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس طرزِ عمل کی ممانعت فرمائی ہے جس میں رہبانیت کی بو تھی اور یا اس کی طرف لیجانے والا تھا۔ مثلاً نکاح سے بچنا، ہمیشہ مسلسل روزے رکھنا، قوتِ گویائی معطل رکھنا، مسلسل شب بیداریاں یا وہ عبادت جس سے جسم آرام اور اہل و عیال اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں وغیرہ۔

رہبانیت کی طرح دوسرا مذہبی تصور بھی جسے ہم نے "ادھوری دینداری" سے موسوم کیا ہے اسلام کے تصور سے بالکل مختلف ہے کیونکہ دین بندے اور خدا کا نجی معاملہ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو اسکی تعلیمات انفرادی زندگی کے مسائل تک ہی محدود ہوتیں وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا نماز روزے کا حکم اور اخلاقیات کی تلقین بس کافی ہے لیکن واقعہ اسکے برعکس ہے اسلام کے نزدیک "دین" انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر میدان میں ہادی اور واجب الاتباع ہے اللہ کا ہر فرمان اور اسکے رسول (صلعم) کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے اور ان کے کسی بھی حکم کو دین سے زائد نہیں خیال کیا جا سکتا۔ یوں بھی سوچئے تو اسطرح کے خیال میں کوئی معقولیت نہ مل سکے گی "اسلام" کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت ہے تو اسکے کسی حکم کو آخر دائرہ اطاعت سے کس طرح باہر رکھا جائے گا۔

غرض اسلام نہ تو رہبانیت کو درست قرار دیتا ہے اور نہ اسکا دائرہ انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہے بلکہ وہ تو ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے اور ملتِ اسلامیہ یا امتِ مسلمہ وہ با اصول جماعت ہے جسکا مقصد اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں پر اپنی زندگی کی پوری عمارت کی تعمیر ہے یہ مسلکِ حیات فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے عالمگیر اور جہانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار و تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوتے ہے بلکہ اسلام دراصل اللہ کی رضا کی خاطر جینے اور اسی کی خاطر مرنے کا نام ہے اور مسلمان وہ

بے جواپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے۔ اور اس کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ہرگز مقدم نہ ہونے دے۔
اب اس میں تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ کہ اسلام کا قبول کر لینا نجات اخروی کا باعث ہے
اور آخرت کی ساری فلاح و کامرانی ایک "مسلم" کے لیے مقرر ہو چکی ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔

بلیٰ من اسلم وجھہ للّٰہ و ھو محسنٌ فلہ اجرہٗ عند ربہ ولا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون۔ (البقرۃ - ۱۱۲)	ہاں جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر دیا (یعنی اسلام قبول کر لیا) اور وہ نیکو کار ہوا تو اس کے لیے اسکے پروردگار کے ہاں اس کا ثواب ہے اور ان (اسلام قبول کر لینے والوں) کو نہ کوئی خوف ہی ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

لیکن آخرت کے ثواب اور وہاں کی فلاح و کامرانی سے پہلے ہر ایک کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ دین کی صحیح پیروی کے بعد مسلمان کی "دنیا" کا کیا نقشہ ہوگا۔ کہ اس کے پاس اس دنیا کی کوئی قابل ذکر چیز باقی رہ جائے گی؟ کیا وہ انفرادی حیثیت سے خوشحال اور اجتماعی حیثیت سے باعزت دبا اقتدار بھی باقی رہ سکے گا؟

اسلام کی دینوی برکتیں

اس سلسلے میں انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوتوں کا سرسری جائزہ مفید ہوگا۔ جب کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو اللہ کے دین کی طرف یہ یقین دلاتے ہوئے بلایا کہ میری پیروی تمہیں آخرت ہی کی نہیں دنیا کی بھی فلاح بخشے گی۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے سامنے اس وعدہ الٰہی کا اعلان کیا تھا۔ "لئن شکرتم لازیدنکم" (اگر تم نے شکر گزاری کی روش اختیار کی تو تمہیں مزید بخشش عطا کروں گا) اور جب تک ان کی قوم اس روش پر چلتی رہی اللہ کا وعدہ بشارت پورا ہوتا رہا حتیٰ کہ عظمت و شوکت میں ان کی قوم سب سے اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچ گئی:

یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین - (البقرۃ - ۱۲۲ -	"اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر برتری عطا کی تھی۔

لیکن جب انہوں نے یہ راہ ترک کردی تو ان کے اوپر سے عزت و اقبال کی قبا بھی اتار دی گئی۔ اور رسوضویت علیھم الذلۃ والمسکنۃ ،، کی مہر ان پر لگا دی گئی۔ کاش ۔۔۔ اگر یہ اہل کتاب تورات کو اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو قائم کرتے جو ان کے رب کیطرف سے بھیجی گئی تھیں تو رزق ان کے اوپر سے بھی برستا اور نیچے سے بھی ابلتا (المائدۃ)

غرض ساری اقوام کے لیے یہ عمومی قانون الٰہی رہا ہے کہ:

ولوان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والأرض ۔ (الاعراف ۔ ۹۶)	اگر بستیوں والے ایمان لائے اور تقویٰ کی راہ چلتے تو ہم انکے اوپر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

اور جنہوں نے ایمان اور خدا پرستی کا راستہ اختیار کیا!

فآتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الآخرۃ ۔ (آل عمران ۔ ۱۴۸)	تو اللہ نے انہیں دنیا کا بھی اجر دیا۔ اور آخرت کا بھی بہترین اجر عطا فرمایا۔

ان متفقہ شہادتوں کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور امت مسلمہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ اور فیصلہ بدل جاتا چنانچہ دینوی فلاح کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ اس امت سے بھی کیا گیا جیسا پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے اور یہ ہر مرحلہ میں کہا گیا مکے کے تاریک و صبر آزما دور میں بھی اور مدینہ کے پرخطر ماحول میں بھی۔ انہیں بھی خطاب کیا گیا جو اسلام لا چکے تھے اور انہیں بھی جو ابھی دائرہ اسلام میں نہ آئے تھے۔ چنانچہ مکہ میں قریش کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے اللہ کا ارشاد تھا:

وان استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یمتعکم متاعاً حسنا (ھود ۔ ۳)	اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور پھر اس کی طرف رجوع کرو تو وہ تمہیں زندگی کا اچھا سامان عطا فرماتا رہے گا ۔۔۔۔

اور اللہ کے رسول نے انہیں یقین دلایا تھا کہ "اگر تم میرا لایا ہوا پیغام قبول کرو گے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوش نصیبی کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی"۔ اور ایک موقع پر اپنے چچا ابوطالب سے کہا تھا "میں انہیں (یعنی قریش کو) صرف ایک بات کی تلقین کرتا ہوں۔ ایسی بات کہ جس کی بدولت سارا عرب ان کا مطیع اور سارا عجم ان کا باجگذار ہو جائیگا"۔ پھر اسی طرح ایمان لا چکنے والوں سے خطاب فرمایا گیا:

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا۔ (النور-۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا جسطرح کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا تھا اور ان کے لیے اس دین کی جڑیں بڑی مضبوط جما دیگا جسے اس نے ان کیلئے پسند فرمایا ہے اور انکی موجودہ حالت خوف کو حالت امن سے بدل دے گا۔

گویا جسطرح اخروی فلاح کے لیے "ایمان" اور "عمل صالح" ایک لازمی شرط ہے۔ اسی طرح دنیوی فلاح وسعادت کے لیے بھی "ایمان" اور "عمل صالح" شرط اولین ہے اور اس لیے مسلمانوں (امت مسلمہ) کا عروج و زوال اسی شرط پر موقوف ہے۔

ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (آل عمران - ۱۳۹)

نہ تم پریشان ہو اور نہ خوف زدہ۔ کامیابی تمہارے لیے ہے۔ بشرطیکہ تم سچے مومن ہو جاؤ۔

ملت اسلامیہ کے لیے عروج وزوال کا یہ قانون دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے دوسری قوموں کے لیے اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بنیادی قسم کی انسانی اخلاقیات اپنے اندر پیدا کریں اور ترقی کی ضروری مادی تدبیریں اختیار کرلیں تو اوپر اٹھ سکتی ہیں۔ لیکن جب امت مسلمہ کا معاملہ ہو تو صرف یہ چیزیں ترقی کا زینہ بننے کیلئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ یہ ملت اس دنیا میں اللہ کے دین کی علمبردار، اور دوسری قوموں کے سامنے حق کی گواہ ہے دوسری کسی قوم کا منصب یہ نہیں ہے منصب کا اختلاف قطعی طور پر حقوق اور ذمہ داریوں دونوں کا اختلاف چاہتا ہے اور اس اعتبار سے معاملے کے ضابطے بھی مختلف ہونگے دوسری قومیں اگر حق کا راستہ چھوڑ کر چلیں تو انصاف کہتا ہے کہ انکا یہ جرم اتنا سخت اور قابل نفرت نہ ہوگا جتنا کہ امت مسلمہ کیطرف سے سرزد ہونے کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے دوسری قوموں کو قدرت کی طرف سے اگر یہ رعایت ملی ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری اختیار کیے بغیر بھی پھل پھول سکتی ہیں اور امت مسلمہ کو نہیں ملی تو ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا جو اللہ کے مخصوص فضل سے سرفراز ہوا ہے اُسے اس مخصوص فضل خداوندی کی ناقدری کی شکل میں اسکے مخصوص عتاب کا سزاوار بھی بننا ہی پڑیگا۔

ان صراحتوں اور شہادتوں سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اسلام اپنے پیروؤں کو دنیا کی فلاح سے بھی خوب نوازتا ہے لیکن یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔

کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے کہا جاسکتا ہے کہ مذہب تو انسان کو آخرت کی ترغیب دیتا ہے اور دنیا سے بے پرواہ بناتا ہے پھر اسے دین کا دامن پکڑنے کے نتیجے میں یہ دنیا کس طرح ہاتھ آجاتی ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے پہلے تو یہ اصولی حقیقت ذہن نشین ہونا چاہئے کہ یہ دولت وعزت اور اقتدار وحکومت وغیرہ جنہیں "فلاح دنیا" سے موسوم کیا جاتا ہے دین کی نگاہ میں بجائے خود معیوب ومعتوب چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اسکا فضل ہیں۔ چنانچہ قرآن کی بے شمار آیات اسکی شہادت دیتی ہیں۔ مثلاً اقتدار وحکومت کے لیے سورۂ مائدہ میں ہے "یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو جبکہ تم میں سے انبیاء بنائے (پیدا کئے) اور تمہیں بادشاہت (اقتدار وحکومت) سے سرفراز کیا" یا دوسری جگہوں پر مثلاً سورۂ نحل میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو بھی "انعم اللہ" (اللہ کی نعمتیں) سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح سورۂ جمعہ اور دوسرے متعدد مقامات پر ان چیزوں کی "فضل" سے ترجمانی کی گئی ہے:

وابتغوا من فضل اللّٰہ۔ (الجمعۃ) اور اللہ کا فضل تلاش (حاصل) کرو۔

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر قرآن وحدیث میں "دنیا" اور "طلب دنیا" کی مذمت کیوں کی گئی ہے؟ اور اس شکل میں اس بات کا مطلب کیا ہوگا کہ "مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے اور دنیا کے کسی مفاد کو آخرت پر ترجیح نہ دے"؟

اس سلسلے میں پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ جس دنیا کو ملعون اور اس کی طلب کو مذموم ٹھہرایا گیا ہے وہ اور چیز ہے اور وہ "دنیا" جس کی فلاح کا مومن حقدار اور طلب گار ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مذموم اور بچنے کے قابل صرف وہ چیزیں ہیں جو انسان کو خدا سے غافل اور اس کے دین کے تقاضوں سے بے پرواہ بنا دیتی ہیں۔ اور وہ "دنیا" جس کی کتاب وسنت میں مذمت کی گئی ہے دراصل انہی چیزوں کا نام ہے۔ لیکن جو چیزیں انسان کو خدا سے غافل نہ بنائیں اور جو دین کے تقاضوں کو پورا کرنے میں روک بننے کے بجائے مددگار ثابت ہوں، وہ ہرگز مذموم اور قابل حذر نہیں ہیں۔ بلکہ ہر طرح سے پسندیدہ اور مطلوب ہیں۔ اور انہیں قرآن مجید میں مذموم وملعون نہیں بلکہ دنیا کی بھلائی (فی الدنیا حسنۃ) عمدہ زندگی (حیاۃ طیبۃ) اور دنیا کا اجر (ثواب الدنیا) وغیرہ فرمایا گیا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ایک مسلمان کے لیے دنیوی فلاح کا مطلب ایسی ہی چیزوں سے ہوتا ہے (جو خدا سے غافل کرنے والی نہ ہوں) کیونکہ فی الحقیقت خدا سے غفلت اور دین کے تقاضوں سے بے پروائی کا اصل تعلق تو انسان کے اپنے نفس سے ہے، نہ کہ دنیا کی چیزوں سے۔ ایک ہی چیز ایک شخص کے لیے خدا سے غافل ہونے کا سبب بن جاتی ہے لیکن دوسرے کے لیے رجوع الی اللہ کا۔ ایک عام آدمی تو معمولی سی جائیداد پاکر بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے مثالی حکمراں جن کو وقت کی عظیم ترین سلطنت کی حکمرانی حاصل تھی ان کو ایسی سلطنت بھی خدا سے ذرہ برابر غافل نہ کرسکی۔ اس لیے امر واقعہ یہی ہے کہ دنیا کی دولت و عزت یا اقتدار و حکومت وغیرہ چیزوں میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہ بری اور قابل احتراز نہیں ہے۔ یہ تو دراصل انسان کا اپنا غلط طرز فکر اور غلط طرز عمل ہے جو ان چیزوں کو اس کے حق میں سم قاتل بنا دیتا ہے لیکن مومن کے بارے میں چونکہ قرآن اور اسلام کا تصور یہی ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی چیزوں کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتا بلکہ اللہ کی مرضی اور ہدایت کے مطابق ہی کرتا ہے اس لیے اس کے لیے یہ چیزیں وہ "دنیا" نہیں ہیں جو مذموم و ملعون ہے بلکہ وہ دنیا ہے جو محمود و مطلوب ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے معنی دنیا سے دستبردار ہو جانے کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ہیں کہ اس کے حاصل کرتے ہیں اور حصول کے بعد اس کے برتنے میں دین کے تقاضوں کو پامال نہ کیا جائے، مقررہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے، اور آخرت کے مفاد کو ٹھیس نہ لگنے دی جائے۔ گویا چند شرعی حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے دنیا سے متمتع ہونا صحیح طرز عمل ہے۔ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے باوجود مومن کے لیے دنیوی فلاح کی راہ بھی مناسب اور ضروری حد تک بالکل کھلی رکھی گئی ہے۔ یعنی جہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مومن کا اصل مطمح نظر فلاح آخرت ہی ہوتی ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ اسلام نے آخرت کی فلاح کا جو راستہ بتایا ہے وہ دنیوی فلاح سے کترا کر نہیں جاتا بلکہ اس کے اندر سے ہو کر گزرتا تھا۔ گویا آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا مآل خود دنیا کے مفاد کو بھی حاصل کر لینا ہے نہ کہ اس سے محروم ہو جانا۔

دوسری بات جس کی طرف دوبارہ نشاندہی کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا "خلیفہ" اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصب ہی یہ ہے۔

کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے، اور اسے اپنے مالک کے احکام اور مرضیات کے مطابق چلائے۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی عزت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو کیونکہ جو چیزیں "اللہ کی نعمت" اور "اللہ کا فضل" ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے۔

قل ھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ۔ (الاعراف-۳۲)	فرما دیجئے کہ یہ ساری (پاک چیزیں) دنیا کی زندگی میں بھی (اصلاً) اہل ایمان (ہی) کیلئے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصۃً انہی کیلیے ہونگی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کے اصل حقدار اللہ کے فرمانبردار بندے ہی ہیں۔ اب اگر ان چیزوں کے اصل حقدار اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے ہی ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ اور نامطلوب کسی طرح نہیں ہو سکتیں۔ اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ کہ اسکا تقاضا کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اسکے احکام کیمطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوتی رہے تو جب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہوں۔ جو اپنے اس فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں۔ اس وقت تک یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہوگی۔ کہ انہیں اس زمین کے اقتدار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوئے یہ اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اپنے اس فرض منصبی کے منکر ہوں اپنے بارے میں نائب کی حیثیت تسلیم ہی نہ کرتے ہوں اور اس دنیا میں اپنی آزاد حاکمیت کے یا کسی اور کی حاکمیت کے مدعی ہوں۔ قرآن کی صراحت ہے:

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (انبیاء-۱۰۵)	زمین کے وارث (حاکم) میرے صالح بندے (ہی) ہوں گے۔

دوسری طرف ان فرض شناس اور خدا کے فرمانبردار بندوں کے لیے یہ بات خود کسی طرح صحیح نہ ہوگی کہ وہ ان قوتوں کے استعمال کرنے سے بے نیازی

بزمیں جیسے پیغمبر اپنے فرض خلافت سے کسی طرح عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتے جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جائیگی۔ بہر حال، ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھیے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ مسلمان صرف اخروی فلاح ہی کا نہیں۔ بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی سچی دینداری کا ہی تقاضا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے آئیے اب ایک نگاہ بازگشت ڈال کر یہ دیکھ لیں کہ اسلام کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں تاکہ اسلام کے تقاضوں کا صحیح صحیح ادراک ہو سکے۔

اسلام کی امتیازی خصوصیات اور انکا تقاضا

پچھلے ابواب کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلام" دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز و مخصوص ہے یعنی یہ کہ صرف اسلام ہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے سارے انسانوں کے لیے ہے خدا کا آخری پیغام ہے اور نجات کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پیروی کی جائے خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی جو دعوت پیش کی وہ مکمل اور ایسی جامع تھی۔ جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور یہ ہدایت ہمیشہ کے لیے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے کافی وشافی ہے۔

آپ (صلعم) کی نبوت عالمگیر ہے۔ آپ کسی زمین کے کسی خاص خطے یا کسی ایک قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا (سبا - ۲۸)	"اے محمد" ہم نے (اللہ نے) تمہیں تمام لوگوں ہی کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے

آپ نے اس کا اعلان خود بھی بحکم الٰہی کیا تھا:

يا ايها الناس - اني رسول الله اليكم جميعا - (الاعراف ۱۵۸)	لوگو! میں تم سب لوگوں کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔

یہ ایک ایسی بات ہے جو آپ (صلعم) ہی کے لیے خالص ہے آپ سے پہلے جو انبیاء آئے تھے ان میں سے کسی کی حیثیت یہ نہ تھی۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے۔

کان النبیّ یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثتُ الی الناس عامۃ (بخاری و مسلم بحوالہٗ مشکوٰۃ) — (یعنی) مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اور آپ (صلعم) کی نبوت جس طرح عالمگیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے آپکے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا اور اب قیامت تک نیا رسول نہ آئیگا۔

ولکن رّسول اللہ وخاتم النبیین (الاحزاب - ۵) — بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنیوالے ہیں۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ ہیں:

ختم بی البنیان وختم بی الرّسل (بخاری و مسلم بحوالہٗ مشکوٰۃ) — (یعنی) مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی۔ اور میرے ذریعہ رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

انہ لا نبیّ بعدی - الحدیث) — بلاشبہ میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔

اس کے مقابلہ میں دوسرے پیغمبروں کی رسالت کا معاملہ کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں۔ پھر جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا آپ (صلعم) جو دین و شریعت لیکر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے جبکہ پچھلے تمام دینوں اور شریعتوں میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا۔ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ "دین کامل" ہو۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (المائدۃ - ۳) — (لوگو) آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین کی حیثیت سے تمہارے لیے اسلام کو پسندیدگی کی سند عطا کر دی۔

واقعہ یہ ہے کہ پہلے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح و ہدایت کے لیے مخصوص تھا۔ اور جس طرح اس کی مخاطبیت کا دائرہ محدود

تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی معیشت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ ایک ایسا نبی بھیجا جائے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الانسانی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے، ہر ملک، اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں۔ قرآن کی مذکورہ بالا آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔

اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہ جوں کی توں محفوظ رہے گی جس پر خود قرآن، حدیث اور تاریخ گواہ ہیں اور یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے۔ جو ایک زندہ زبان ہے کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو ان صفات کی حامل ہو۔

رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر کچھ لازمی تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور اب اللہ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے:

عند الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران - ۱۹)	بلاشبہ اللہ کے نزدیک مقبول دین تو صرف اسلام ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے ورنہ:۔

و من یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ۔ (آل عمران - ۸۵)	اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہر گز قبول نہ کیا جائے گا۔

کیونکہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے۔ تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ

باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کیطرف وہ بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں :-

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء - ٦٤)	ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس لیے آپ (صلعم) کا سارے انسانوں کیطرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اسکا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اس کی پیروی کرے اگر کوئی شخص آپ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپکے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ (صلعم) کے نہیں بلکہ اس فرمانروائے کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپکو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بناکر بھیجا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی موجود ہے اگر یہ بات قرآن کے نزدیک بھی صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور کسی ایک رسول کی پیروی کافی ہے تو اسکا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود اور نصاریٰ کو اسلام کی دعوت نہ دیتے کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے اس کے برخلاف آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ محض تورات اور انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ (صلعم) نے انہیں بھی اسیطرح اسلام کی دعوت دی جسطرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے مشرکوں کیلیے ضروری قرار دیا تھا :-

یا ایھا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھم او نلعنھم (النساء - ٤٧)	اے اہل کتاب! اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے ہم نے اتارا ہے جبکہ وہ اس کتاب (کی پیشین گوئیوں) کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے قبل اسکے ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انہیں پیچھے کیطرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں…

نہ صرف یہ کہ آپ (صلعم) نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں "کفر" کا مرتکب قرار دیا

گیا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ "بدترین کفر" اور انہیں صرف کافر ہی نہیں "پکا کافر" کہا گیا۔

"جو لوگ اللہ کے اور اسکے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کر دیں اور کہتے ہیں کہ بعض پیغمبروں کو ہم مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کی کوئی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے" (النساء ۔ ۱۵۰، ۱۵۱)

یا اہل کتاب کے انکار اسلام پر ایک جگہ یوں تبصرہ کیا گیا :-

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی تھی اور اس طرح وہ اس کے ماسوا ایات الٰہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں" (البقرۃ)

دعوت اسلام کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدت ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے، یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اسکی پیروی کرنا کافی نہیں ہے آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہوا؟ وہ اپنی جگہ حق ہے اور یہ اپنی جگہ حق ہے۔ لیکن انکے اس "فلسفے" کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اسے صاف طور سے "کفر کا فلسفہ" قرار دیتا ہے اور انہیں "یہ بھی حق وہ بھی حق" کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر (کافر) ٹھیراتا ہے۔ ۔ ۔

اسکے علاوہ جب قرآن کے سوا اب کوئی دوسری کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ صورت حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ہمیں منسوخ قرار دیا جا چکا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہر شخص کے لیے اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی اور دین اللہ کے حضور منظور شدہ اور قابل قبول نہیں رہ گیا ہے تو اس کے معنی یہ بھی ہیں ۔ کہ اسلام ہی شرط نجات ہے ۔ ظاہر ہے ۔ کہ

اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور نا قابل قبول ٹھیرا چکا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دیگا؟ چنانچہ "ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ" فرمانے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے کہ:

وفی الآخرۃ من الخاسرین۔ اور ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامراد رہے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت (مراد گروہ انسانی) میں سے جس کسی بھی شخص تک (مثلاً) یہودی یا نصرانی تک، میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اسکے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا" (مسلم)

اس فیصلہ خداوندی کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور ملتیں بھی آتی ہیں بلکہ ایک حیثیت سے تو دوسری قوموں اور ملتوں کا معاملہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیونکہ دنیا کی ساری قوموں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جنکو قرآن نے صاف و صریح لفظوں میں "اہل کتاب" کہا ہے اور جنکو کسی نبی کا امتی اور کسی آسمانی شریعت کا حامل قرار دیا ہے اب اگر ایسی ملتوں کے افراد کے لیے بھی رسالت محمدی کی پیروی شرط نجات ہے تو عقل کہتی ہے کہ ان قوموں اور ملتوں کے لیے اسکا شرط نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہوگا جنکو قرآن نے صاحب کتاب و شریعت کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔

غرض، جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات قرار دیتا ہے اور اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس تک اسلام کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو اور اس پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری امت مسلمہ کی ہے انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمان اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دنیا کے سامنے اس حق کی شہادت دیں۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

ان وضاحتوں کے بعد کہ صرف "اسلام" ہی ہر حیثیت سے جامع، کامل، سارے انسانوں کے لیے اور آخری دین ہے نیز نجات کے لیے اس کی پیروی شرط ہے عقل

کہتی ہے کہ اسلام کو اگر یہ مخصوص حیثیت دی گئی ہے تو اس مخصوص حیثیت کا ایک مخصوص تقاضا بھی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اسے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچنا چاہیئے اور برابر پہنچتے ہی رہنا چاہیئے قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہوتی چاہیئے اور پیہم ہوتی رہنی چاہیئے فرد فرد کو اسکا پیغام دیا جانا چاہیئے اور مسلسل دیا جاتا رہنا چاہیئے ورنہ دنیا اسے جان پہچان نہ سکے گی اور جب جان ہی نہ سکے گی تو اس پر ایمان کس طرح لاسکے گی حالانکہ وہ اس پر ایمان لانے کی مکلف قرار دی گئی ہے اور اگر ایمان نہیں لاتی تو بدبختی کا شکار ہوتی ہے یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوگی کہ لوگوں کے لیے ان کے مالک کی بھیجی ہوئی شریعت ایک رازینی رہے اور انہیں بے خبری ہیں پکڑا جائے اس لیے اگر انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام ہی کی پیروی کرے تو اس فرض سے پہلے اس کا یہ حق ہے کہ اسے دین سے واقف کرایا جائے اگر یہ نہیں ہوتا تو خود اسلام پر بھی ظلم ہے کہ وہ بڑی حد تک ایک معرف بن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت پر بھی ظلم ہے کیونکہ اس طرح وہ اس نعمت سے لازماً محروم رہ جاتی ہے جس پر اس کا مقدر موقوف ہے۔

جب تک اسلام کا لانے والا رسول دنیا میں موجود تھا بلاشبہ اس نے بہترین طریقے سے انسانیت کا یہ حق ادا کیا مگر اس کے چلے جانے کے بعد بھی تو یہ حق اپنے ادا کیے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور تا قیامت کرتا رہے گا ایسا تو کوئی نبی بھی آنے والا نہیں ہے کہ یہ حق اسکا انتظار کرے بہر حال اگر اب اسلام کی اس مخصوص حیثیت کے ضروری تقاضے کا کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا تو ضروری ہے کہ وہ پورا ہو۔ کیسے پورا ہو؟ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے جسکا کوئی نہ کوئی عملی حل ہونا چاہیئے اور صرف اسلام کی زبان سے ہونا چاہیئے کیونکہ اگر اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے فی الواقع ساری دنیا کے لیے اور ہمیشہ کے واسطے بھیجا گیا ہے تو ضروری ہے کہ اس مسئلے کا کوئی مقررہ حل اس کے پاس موجود ہو۔

اسی ضرورت کے پیش نظر قرآن اس عظیم مسئلہ کا عظیم الشان حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

وکذٰلک جعلنٰکم امۃً وسطًا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ - ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم (مسلمانوں) کو بہتر۔ (درمیانی) امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے (ہمارے نازل کردہ دین کے شاہد ہو اور ہمارا رسول تمہارے لیے شاہد بنے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عملی شکل یہ قرار پائی ہے کہ :-

(۱) اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے اُسکے چلے جانے کے بعد وہ اُس کے پیروؤں کے ذمے ہوگیا ہے۔ اور اب یہ لوگ اس وقت تک کے لیے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

(۲) اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہے۔ بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے "شہادت" (گواہی) کہہ سکیں۔

(۳) "اسلام کی شہادت" دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جسکا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان ہر ممکن حد تک ٹھیک اسی طرح کریں جسطرح کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (صحابہ) تک اسکے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی ہیں کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو امت مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسول سامنے رکھ گیا ہے۔ مختصراً یہ امت اپنے مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اور بحیثیت امت اس کی زندگی کا مشن ٹھیک وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔

امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ "ہم نے تمہیں ایک بہتر امت (یا امت وسط) بنایا ہے۔ تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لیے دین حق کے گواہ رہو۔ اس امت کی حیثیت صاف طور سے یہی مقرر کر رہا ہے۔ مزید صراحت اس ارشاد میں ہے "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" (آل عمران) (تم ایک بہتر امت ہو جو سارے انسانوں (کی اصلاح) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے) ان لفظوں میں صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ امت صرف اسی طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں۔ بلکہ ایسی

امت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہدایت اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ امت مسلمہ کی اصل قدر و قیمت بھی اسی شہادت پر موقوف ہے۔ وہ "امت وسط" اور "خیر امت" فی الواقع اسی وقت تک ہے جب تک کہ دنیا کے سامنے حق کی گواہ بن کر کھڑی رہتی ہے ورنہ ان خطابات کے استحقاق سے محروم ہو جائیگی کیونکہ اسکا یہ نام صفاتی نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لیے ملا ہے کہ اس کی اصلاحی ذمہ داریاں دوسری امتوں کے مقابلہ میں دوہری تھیں۔ سورۂ حج کے الفاظ قابل غور ہیں:

"اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام "مسلم" رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے دین حق کا شاہد ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے شاہد بنو (الحج ۷۸)

اس آیت میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ امت مسلمہ کا نام اور مقام کیا ہے وہیں اسے اور ساری دنیا کو یہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اس نام اور کام کی وجہ سے اسکا وہ مشن ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً "امت مسلمہ" ہے اور اس سلسلے میں وہ خدا کے حضور جواب دہ بھی ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک مسلمان کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی وہیں پوری امت کو ایک امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی جواب دہی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ کوئی معمولی جواب دہی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جسطرح کی انبیاء علیہم السلام کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی۔ کیونکہ اگرچہ امت مسلمہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے:

فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین (الاعراف - ۶)	پس ہم ضرور حساب لیں گے ان لوگوں سے جنکے پاس پیغمبر بھیجے گئے اور ان پیغمبروں سے بھاری حساب لینگے

شہادت حق

اسلام کی یہ شہادت کیا چیز ہے؟ اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے جو یہاں پہنچ کر لازماً پیدا ہوتا ہے اور جس کا جواب ملنا خود اسلام کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اصولی طور پر اور مجملاً اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح اسلام اور دین حق ایک متعین چیز ہے اسی طرح دین حق کی اس شہادت کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعین ہے اور یہ تعیین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔

"شہادت" یا گواہی عرف عام میں اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعہ یا کسی چیز کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہو دوسروں کو ٹھیک ٹھیک بتا دے اس لیے دین حق کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر اسلام کو جیسا کچھ وہ ہے پوری طرح واضح کر دیا جائے اب رہا قرآن کا اصطلاحی مفہوم تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت ہے اور بلندی آگئی ہے جس کی وضاحت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ کی روشنی میں یہ ہے کہ شہادت حق کے دو پہلو ہیں۔

(الف) قولی شہادت: قولی شہادت تو یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک پوری دنیا کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارات میں پیش کیا جائے یہاں تک کہ یہ دین ان کے لیے بالکل کھلی کتاب بن جائے اور غیر مسلموں کے سامنے ان کے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صداقت پالینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لیے چند باتیں ضروری ہیں:

(۱) اسلام کے بنیادی عقائد پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کی جائیں جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید، رسالت آخرت وغیرہ پر جس زور و قوت کے ساتھ اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں، اس کا اتباع بنیادی ضرورت ہے۔ نیز زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کے احکام اور ان کی تفصیل پیش کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔

(۲) غیر اسلام پر سنجیدہ اور مدلل تنقید کی جائے۔ اس تنقید کے لیے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر مسلم دنیا پیروی کر رہی ہے اور جو اس وقت کے مذہب، تہذیب، اور فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کیے ہوئے

عملی نتائج کو بھی بتایا جائے جنہیں کسی طرح بھی انسانیت کے لیے خوش آئند نہیں کہا جاسکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید شہادت اسلام کی راہ کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔

(۳) اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دلنشین اور جدید ترین انداز میں انجام دیا جائے اس زبان میں ہو جس سے وقت کا انسان مانوس ہے اس طرز کا ہو جو آجکل کے ذہنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے، اس طریقے کا ہو جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیونکہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں ہے بلکہ دین حق کی تبلیغ اور توضیح کی خاطر ہے قرآن نے بھی اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان، انداز، اسلوب اور طرز استدلال انتہائی مناسب، مانوس، معیاری اور واضح اختیار کیا ہے جو مخاطب کے لیے سب سے زیادہ موثر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت دینے کے بارے میں یہ ہدایت کی تھی کہ دنیا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ، اور ضرورت کے وقت بہترین انداز سے بحث و مباحثہ کرو۔ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن

(۴) اس تبلیغ و دعوت کے پیچھے کوئی قومی غرور، کوئی حریفانہ جذبہ، اور کوئی مناظرانہ ذوق ہرگز کارفرما نہ ہو۔ بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و للہیت کے ساتھ نکلے۔ اور محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر نکلے۔

(ب) عملی شہادت: عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جائے۔ امت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں، پوری امت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ ان میں توحید، آخرت، اور رسالت وغیرہ عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق و آداب، معیشت و معاشرت، سیاست و معاملات غرض انکی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ الٰہی نقشے کے مطابق تعمیر ہو۔ "عملی شہادت"، کا مرتبہ "قولی شہادت"، سے مقدم ہے اس لیے جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی

دعوت دے، کیونکہ نتیجہ کے اعتبار سے بھی اس کی کوشش زیادہ بار آور نہ ہوگی۔

اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے متعلق کچھ عرض کرنا بالکل غیر ضروری ہے کہ آپ نے جب بھی ایمان کی دعوت دی تو اس حال میں کہ پہلے خود ایمان والیقان کے پیکر بن چکے تھے۔ اور جب دوسروں کو اللہ کا حکم سنایا تو اس طرح کہ سر مبارک اسکے آگے پہلے جھک چکا تھا۔ آپکے ارشادات، "انا اول المؤمنین" (میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں) اور "انا اول المسلمین" (میں سب سے پہلا اطاعت کرنیوالا اور سر تسلیم خم کرنیوالا ہوں) اس پر دلالت کرتے ہیں۔

* پھر انسان کی ذہنیت ایسی ہے کہ وہ پست، درماندہ اور محکوم اقوام کے طریقِ زندگی فلسفہ اور دین کیطرف راغب نہیں ہوتا۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ علمی اور اقتصادی میدانوں میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں اسوقت مسلمان اقوام کی درماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں جوشِ عمل اور محنت کی عادت کا فقدان ہے اور سہل انگاری، کاہلی اور کم ہمتی ان کی خصلت میں شامل ہو گئی ہیں، جب تک مسلمان ان خرابیوں میں گرفتار رہیں گے نہ ان کا اخلاقی معیار بلند ہوگا نہ دنیوی فلاح انہیں حاصل ہوگی وہ پست اور درماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام رہے گا اور دوسری اقوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گا، بلکہ خود مسلمانوں کے ذہن اسلام سے ہٹ کر اور راستے تلاش کریں گے۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے زہر آلود اثرات اسوقت بھی اسلامی معاشرہ کو بربادی کیطرف لیے جا رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کا شاہد اسوقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنی کوشش، ایثار، اور محنت سے اپنے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے قابل ہو۔

موانع اور ان کا سدباب

یہ دنیا خیر اور شر دونوں کا مسکن ہے۔ یہاں بھلائی اور برائی دونوں کی طاقتیں موجود ہیں۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کر لینے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ اسکے "شاہدوں" کی شہادت قبول نہ کیجائے بلکہ سرے سے اس شہادت کو برداشت بھی نہ کیا جائے جیسا کہ ہر دعوت کی تاریخ اول آگے دن کا مشاہدہ بتاتا ہے۔

*۔۔۔ یہ پیراگراف اضافہ ہے۔

اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں امت مسلمہ کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اسلام اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے مسلسل اور آخری حد تک کی جائے۔ اس کوشش کو شریعت نے "جہاد فی سبیل اللہ" کا نام دیا ہے جہاد کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوشش صرف کی جائیں اور اپنے مقصد تک پہنچنے کیلئے اپنی ساری طاقت لگا دی جائے۔ اس لیے "راہ خدا" میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو انسان کے بس میں ہو پوری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دینے کا نام جہاد ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کیا ہو۔ اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ حالات کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے تین مختلف شکلیں مقرر کی ہیں (۱) داخلی جہاد (۲) دعوتی اور فکری جہاد (۳) مسلح جہاد۔

(۱) داخلی جہاد: داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھائیں انکے خلاف جدوجہد کی جائے اور برائیوں کو ختم کر کے نیکیوں کو پروان چڑھایا جاوے۔ کیونکہ یہ اندر کی برائیاں شہادت اسلام کی راہ کی بڑی خطرناک رکاوٹ ہوتی ہیں اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل ارشاد کا ایک حصہ یہ ہے "پس جس نے ان (نافرمان۔ اللہ و رسول کے احکام کو پس پشت ڈالنے والوں) کے خلاف اپنے ہاتھوں سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اسکے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہوتا" (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ) اس حدیث سے یہ دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں کہ:

(الف) مسلم معاشرے کے اندر جو برائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش "جہاد" ہے۔

(ب) اس کوشش یا "جہاد" کی عملی صورتیں کیا کیا ہو سکتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے۔ سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس برائی اور ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے۔ اور اپنے ہاتھوں سے اس کو ختم کر دیا جائے

لیکن اگر اس کا اختیار یا اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر زبان سے اس کی برائی کو واضح کیا جائے۔ برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے۔ نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے، آخرت یاد دلائی جائے اللہ کی ناراضی سے ڈرایا جائے، اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و تنبیہہ بھی کی جائے۔ لیکن اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو تو ایسا تو لازماً ہونا چاہیے کہ اس برائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے وہ آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے۔ آرزو اور دعائیں کی جائیں کہ یہ برائی جلد سے جلد مٹ جائے۔

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر شکل در جہاد ہے کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے اور اسلام کی شہادت انجام پانے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے اور حق کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے

پھر برائیوں کے مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے ٹھیک انہی کو بعض احادیث میں "تغیر منکر" سے اس طرح موسوم کیا گیا ہے "تم میں جس شخص کو کوئی برائی (منکر) نظر آئے تو چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس کی بھی جرأت نہ رکھتا ہو تو یہ کوشش اپنے دل سے کرے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے" اور ان ہی کوششوں کو "نہی عن المنکر" کے پیرایہ میں بھی ادا کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں ہے۔ "وامر بالمعروف وانہ عن المنکر" یعنی بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ ایک حدیث میں ہے۔

ائتمروا بالمعروف وتناھوا عن المنکر۔	نیکی کی ایک دوسرے کو تلقین کرو اور برائی سے ایک دوسرے کو روکو۔

یہ "جہاد" امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس فریضے سے نہ تو افراد بری الذمہ ہیں اور نہ ریاست۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں سبھی شریک ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔	مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں، وہ ایک دوسرے کو بھلائی کا

حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔۔۔ (التوبہ - ۷۱) ۔۔۔۔۔۔۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بھلائی (معروف) کا حکم دینا اور برائی (منکر) سے لوگوں کو باز رکھنا مسلمان کی کبھی نہ ختم ہونے والی صفت ہے۔ یہ ایمان کی فطرت ہے۔ یہ اسلام کا نعرہ ہے۔ جہاں مسلمان ہوگا یہ کام بھی وہاں ضرور کیا جا رہا ہوگا۔ اور جو مسلمان ہوگا وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

مسلمان جب قوت و اقتدار کے مالک ہوں تو ان کی ذمہ داری یہ قرار دی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں اسلامی ریاست کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ:

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج - ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

گویا مسلمان جس طرح اپنی عام اور انفرادی حیثیت میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ برائی پنپے اسی طرح صاحب اقتدار ہو کر بھی وہ اسے برداشت نہیں کرے گا۔ بلکہ منکرات کو مٹانا اس کے اقتدار کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں شامل ہوگا۔

(۲) دعوتی اور فکری جہاد: دعوتی اور فکری جہاد کا مطلب یہ ہے۔ کہ غیر مسلم حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو پیش کیا جائے، جو اعتراضات اٹھائے جائیں، جو دلیلیں دی جائیں، ان کا مناسب جواب دیا جائے۔ اور کوئی شبہ یا اعتراض یا دلیل رد کئے بغیر ایسی نہ چھوڑی جائے جو اسلام کے چہرے کا باریک سا بھی حجاب بن سکتی ہو۔ مکی دور سراسر اس جہاد کا دور تھا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلعم) کو حکم دے رکھا تھا:

فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جہادا کبیرا۔ (الفرقان - ۵۲)	تو تم ان منکرین اسلام کا کہنا نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان سے پورا پورا جہاد کرتے رہو

قرآن کے ذریعے جہاد کا مطلب غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے ان قرآنی دلیلوں کو برابر پیش کرتے رہو جو اسلام کی سچائی کو اور ان کے وجوہ انکار کی بے وقعتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری برابر عیاں کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے۔ یہ کام پورے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو یہاں تک کہ انہیں اپنے افکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بھی معقول بات نہ رہ جائے اور ہر طرف سے گھر کر اگے مزید جائیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کام کو "زبان کا جہاد" ہی فرمایا ہے چنانچہ آپکا ارشاد ہے :-

جاھدوا المشرکین باموالکم — مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور

وانفسکم والسنتکم (ابوداؤد) — اپنی زبانوں کے ذریعے جہاد کرو۔

اس طرح دعوتی اور فکری جہاد دراصل عقل و استدلال کے اسلحہ سے لڑنے کا نام ہے اور یہ لڑائی اسوقت تک لڑنی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سارے فکری اور استدلالی قلعے مسمار نہ ہو جائیں۔ چاہے وہ کسی قسم کے ہوں چنانچہ قرآن پاک نے عربوں کی ایک ایک دلیل اور ان کے اٹھائے ہوئے ایک ایک اعتراض کے جس طرح پرخچے اڑائے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، اسکا حال معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ان فیصلہ کن الفاظ کو سن لینا کافی ہے جیسا اس سلسلے میں اعلان فرما رکھا تھا۔

ولا یاتونک بمثل الا جئناک — اے محمد! یہ لوگ تمہارے سامنے جو انوکھے سے انوکھا

بالحق واحسن تفسیرا۔ — اعتراض بھی لیکر آئیں گے ہم اسکے جواب میں تمہیں

(الفرقان - ۳۳) — ٹھیک بات اور بہترین وضاحت والی دلیل ضرور بتا دینگے

پھر یہ فکری اور استدلالی لڑائی جس انداز سے لڑنا چاہیے اس کے لیے قرآن نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ "بحث و مباحثے کا وہ طریقہ اختیار کرو جو سب سے اچھا ہو"، (وجادلھم بالتی ھی احسن) یعنی یہ کہ وہ خیر خواہانہ، دل نشیں، اور مدلل ہو۔ جس میں مخاطب کے ذہن، عقل و فہم، اور نفسیات کی رعایت رکھی گئی ہو۔ پھر اس جہاد کی ایک لازمی شرط "صبر و استقلال" ہے تاکہ داعی طعن و تشنیع، سخت کلامی، دل آزاری، ایذا رسانی اور رنج کے طوفان میں

عالی ظرفی، حق پسندی، دل سوزی، معقولیت اور سنجیدگی کا ثبوت دے۔ صحابہ کرامؓ تک کو اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا تھا۔

ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب
من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذًی
کثیرًا وان تصبروا وتتقوا فان ذالک
من عزم الامور۔
(آلِ عمران - ۱۰۶)

اور تمہیں اہلِ کتاب کی طرف سے بھی اور مشرکوں کی طرف سے بھی بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔ اگر ایسے وقت تم نے صبر سے کام لیا اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہے تو بلاشبہ یہ بڑے حوصلے کی بات ہوگی۔

لیکن اسکا مطلب پست ہمتی، حق سے اعراض اور مصالحت کا خیال ہرگز نہ سمجھنا چاہئے۔

فاصدع بما تؤمر واعرض
عن المشرکین۔ (الحجر - ۹۴)

جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف طور سے سنا دو اور مشرکوں کی پرواہ نہ کرو۔

(۳) مسلح جہاد: اس کی تیسری شکل مسلح جہاد ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روکنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے۔ اور اسوقت تک کی جائے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے۔ یہ جہاد کی آخری اور افضل ترین شکل ہے کیونکہ مسلمان اس میں اپنا مال، وقت، صلاحیت اور بالآخر اپنی جان خدا کی راہ میں صرف کر دیتا ہے عملی طور پر یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزما قسم ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسلامی ریاست اور نظام اجتماعی کے تحفظ کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے جیسا کہ (مسلح) جہاد کا حکم دیتے ہوئے واضح کر دیا گیا تھا۔

کتب علیکم القتال و
ھو کرہ لکم وعسیٰ
ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم
(البقرۃ - ۲۱۶)

مسلمانو! تم پر لڑائی فرض کر دی گئی ہے اگرچہ وہ تم کو ناگوار محسوس ہو رہی ہو لیکن ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور (فی الواقع) وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

یہ قتال اور یہ جہاد اسلام کے حق میں "بہتر" کس طرح ہے؟ اس کی وضاحت اُن آیتوں میں ملیگی جہاں جہاد کی غرض و غایت بتائی گئی ہے۔ مثلاً

"وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ" (اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ وفساد باقی نہ رہ جائے اور دین (اطاعت) اللہ کے لیے ہو جائے۔ یعنی جنگ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جائے اور "فتنے" کی حالت ختم ہو جائے۔ "فتنہ" قرآن کا اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اسلام کی پیروی کا حق نہ دیا جائے اور انہیں اپنے معبودِ حقیقی کی بندگی سے روکا جائے۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا ظلم ہے جس سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ خونِ ناحق کی بھی اس کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ اگر کسی کی جان لی جائیگی تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اسے دنیا کی چند روزہ بہار سے محروم کر دیا گیا لیکن اگر کسی سے اس کی "خدا پرستی" لے لی گئی اور اپنے رب کا بندہ بننے سے اسکو روک دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل زندگی تباہ کر دی گئی۔ اور اسے آخرت کی ابدی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ بلاشبہ دونوں ہی چیزیں ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن جب دونوں میں سے ایک کا انتخاب ضروری ہو تو ایک احمق بھی پہلی کے مقابلے میں دوسری کا انتخاب نہ کریگا۔ اسی لیے قرآن اسکی تصدیق اس طرح کرتا ہے: "والفتنۃ اشد من القتل"۔ (فتنہ قتل سے بھی زیادہ (بری) چیز ہے۔ ایک اور آیت مسلح جہاد کی ضرورت پر ایک نئے پہلو سے روشنی ڈالتی ہے۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ (الحج ۴۰)

اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعضوں کے ذریعے دفع نہ کیا کرتا تو ڈھا دیئے جاتے صومعے اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

اس آیت سے اور زیادہ واضح ہو گیا کہ اگر دین کی حفاظت کی خاطر تلوار نہ اٹھائی جائے اور "فتنہ" کی جڑ نہ کاٹ دی جائے تو خود دین کی جڑ کٹ جائیگی فتنہ پسند عناصر خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیں گے اور خود خدا کا نام لینا دو بھر کر دیں۔ گھر اور خدا پرستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کر دم لیں گے اس بنا پر دین کی بقا اور تحفظ کے لیے مسلح جہاد کی ضرورت ناگزیر ہے۔

*لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ اسلام تبلیغ دین کے لیے قوت کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لا اکراہ فی الدین (البقرۃ ۲۵۶) دین کے معاملات میں قوت کا استعمال جائز نہیں

مسلح جہاد کی اجازت جن مقاصد کے لیے ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) مدافعت: یعنی جب دشمن آپ پر حملہ کرے تو دین اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے تلوار استعمال کی جائے۔

(۲) دفع فتنہ: یعنی جب انسانوں پر ظلم کیا جائے اور دعوت دین کے دستوری اور قانونی راستے بند کر دئے جائیں اور خدا کے بندوں کو انسانوں کی غلامی میں جکڑ لیا جائے تو شر اور فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اور منکر کے تسلط کو توڑنے کے لیے قوت استعمال کی جائے۔

اسلام طاغوت کے بت کو توڑنے کے لیے تو قوت استعمال کرتا ہے لیکن کسی انسان یا گروہ کو جبریہ مسلمان بنانے کی کلی مخالفت کرتا ہے ہر شخص کے سامنے دین کی دعوت پیش کر دی جائے۔ حق کو باطل سے ممتاز کر دیا جائے اور پھر آخری فیصلہ اس کے ضمیر پر چھوڑ دیا جائے اسے حق ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ ہمارا فرض طاغوت کے پھیلائے ہوئے جالوں کو توڑنا، ظلم کے بندھنوں کو کاٹنا اور حق کی دعوت پہنچا دینا ہے پھر اگر کوئی اس دعوت کو قبول کرتا ہے تو وہ امت مسلمہ کا جزو ہے اور اگر قبول نہیں کرتا تو اسے اس کا بھی پورا پورا اختیار ہے اور اگر وہ اسلامی ریاست اور مسلم معاشرہ میں رہتا ہے۔ تو اس کا مال اور اس کی جان ہمارے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی کسی مسلمان کی۔ ہماری ذمہ داری حق کی دعوت پہنچا دینے کی ہے اور اگر ہم یہ فرض ٹھیک ٹھاک ادا کر دیتے ہیں۔ تو ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم دین کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں تو ہم سے لازماً باز پرس ہوگی*